اردو شاعری میں
بہار کے ہندو شعرا کا حصّہ

ڈاکٹر اسرار احمد

اردو شاعری میں
بہار کے ہندو شعرا کا حصہ

ڈاکٹر اسرار احمد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

URDU SHA-E-RI MEIN BIHAR KE
HINDU SHO-A-RA KA HISSA

by : Dr. Asrar Ahmad

Year of Edition 2009
ISBN 978-81-8223-596-0

Price Rs. 200/-

نام کتاب : اردو شاعری میں بہار کے ہندو شعرا کا حصہ
نام مصنف : ڈاکٹر اسرار احمد
کمپوزنگ اور کور ڈیزائننگ : ایم.ایم. کمپیوٹرس (محمد معظم احمد)، سلطان گنج، پٹنہ ٦
سال اشاعت : ۲۰۰۹ء
ناشر : ڈاکٹر اسرار احمد، نیا بازار، تھانہ روڈ، سیوان۔ 841226
فون نمبر : 0615-4242570
موبائل نمبر : 09934675144, 09835868667
قیمت : ۲۰۰ روپے
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔٦

ملنے کے پتے

☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۴ ☆ مرکز تحقیقات اردو فارسی، گوپال پور
☆ الطاف منزل، سائیکل پرائیوٹ لمیٹڈ، نیا بازار، تھانہ روڈ، سیوان، بہار

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

نیک دل پھوپھی
نجب النساء (مرحومہ)
کے نام
جن کے ایثار کا کوئی بدل نہیں
اور
جن کی دعائیں
ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں

فہرست

⊙⊙⊙

پیش لفظ

ایک زمانے سے یہ سازش رَچی جاتی رہی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، حالانکہ اس کی تشکیل اور ارتقا میں ہند لسانی کلچر ہے جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ، عیسائی اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی بہت فعال رہے ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ لسانی تشدد میں سب سے زیادہ زد میں آنے والی زبان اردو ہی ہے۔ ''کدم راوَ، پدم راوَ'' سے لے کر آج تک کتنی ہی ممتاز کتابیں، ہندوؤں، سکھوں، یہاں تک کہ انگریزوں کے قلم سے نکلی ہیں اور شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ ماضی کو فراموش کر دیجیے تو آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مسلمان نہیں ہیں لیکن آج کی مروّجہ صنفوں میں نہ صرف قابل احترام ہیں بلکہ بہت حد تک اس زمانے کے ارتقائی سفر میں اہم رول انجام دے رہے ہیں۔ داستان ہو کہ ناول، افسانہ ہو کہ انشائیہ، طنز و مزاح ہو کہ سفرنامہ، مرثیہ ہو کہ مدحیہ کلام، غزل ہو کہ نظم سبھی مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار بھی ہیں اور اس زبان کو تقویت پہنچانے کا باعث بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندو، سکھ یا عیسائی ادیبوں کو کبھی نظر انداز کیا گیا ہو، ان کی کاوشوں کو سراہنا، امتیاز بخشنا، یہاں تک کہ ان کے نام کو زندہ رکھنا عوام و خواص کا مزاج رہا ہے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ اردو، ہندی کی حریف سمجھی جاتی ہے، وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن یہ سچ ہے کہ جو امتیاز ہندی ادب اور ہندی ادیبوں کو حاصل ہے، وہ اردو کے مقدر میں نہیں اور اس کی وجہ سیاسی بھی ہے اور لسانی بھی۔ میں اس امر پر زیادہ گفتگو کرنا نہیں چاہتا لیکن محسوس کرتا ہوں کہ اس رویے کو ہر سطح پر نشان زد کر کے کھلی فضا قائم کرنی چاہیے۔

اس وقت ڈاکٹر اسرار احمد کا تحقیقی مقالہ بصورت مسودہ میرے پیش نظر ہے۔ عنوان ہے ''اردو شاعری میں بہار کے ہندو شعرا کا حصہ''۔ میں نے اس کی محتویات پر ایک نگاہ ڈالی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے ضروری امور لازماً قلم بند کر دیے ہیں۔ ان میں ایک طویل فہرست ہندو ادیبوں اور شاعروں کی بھی دی گئی ہے لیکن یہ فہرست یقیناً محدود ہے۔ اس لیے کہ اگر صرف نام گنوائے جائیں یعنی ہندو ادیبوں اور شاعروں کے نام تک اس مسئلے کو محدود رکھا جائے تو پھر کئی جلدوں کی ضرورت پڑے گی لیکن ڈاکٹر اسرار احمد کا تعلق بہار کے ہندو شعرا سے ہے، اس لیے اپنے طور پر موصوف کی کوشش رہی ہے کہ قابل لحاظ شعرا کے کارنامے اختصار سے سامنے آجائیں اور اس عمل میں وہ ناکامیاب نہیں ہیں۔ تذکروں سے لے کر دوسری صنفوں سے متعلق بہار کے ہندو شعرا کا ایک سرسری تعارف ہو جاتا ہے۔ کئی نام ایسے بھی ہیں، جن سے لوگ واقف نہیں۔ یہ مقالہ اس کمی کو پورا کرنے کی ایک جہت ہے۔

یہ مقالہ پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں دور متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے ہندو شعرائے بہار سے بحث کی گئی ہے۔ تحقیقی مقالوں کی اپنی ایک روش ہوتی ہے۔ صفحات بھی بہت زیادہ بڑھائے نہیں جا سکتے لہٰذا اختصار سے جو کچھ لکھنا تھا، مقالہ نگار نے بطریق احسن یہ کام انجام دیا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مباحث میں تنقیدی پہلو نہیں ہے، یہاں محض اشارے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس کی گنجائش زیادہ تھی بھی نہیں، اس لیے جو کچھ بھی ہے وہ اہم ہے اور اس سے ابتدائی ہندو شعرا کا تعارف بخوبی ہو جاتا ہے۔

دوسرے باب میں ان ہندو شعرا سے بحث کی گئی ہے جن کا تعلق بہار سے ہے اور جنھوں نے اردو شاعری میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ مقالہ نگار کی کاوش رہی ہے کہ وہ متعلقہ شعرا کے کلام کے حسن و قبح پر ایک نظر ڈالے۔ یہ کام مشکل ہے اس لیے کہ تنقیدی بصیرت انھوں کو حاصل نہیں ہو سکی لیکن یہاں جس محدود

پیمانے پر تنقیدی روش اپنائی گئی ہے وہ لایعنی نہیں۔ کتنے ہی اشارے سامنے آجاتے ہیں جن پر لمبی گفتگو ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد موصوف نے اس امر پر زور دیا ہے کہ بہار میں ہندو شعرا کا کیا رول رہا ہے اور اس زبان و ادب کے ارتقا میں ان کی شاعری کس نہج پر کام کرتی رہی ہے۔ اس باب کو قدرے طویل ہونا چاہیے تھا اور خاص خاص عنصر پر توجہ کرنی چاہیے تھی۔ مقالہ نگار نے بعض سے کام نہیں لیا ہے لیکن ان کا شعور، وجدان اور مطالعہ جتنی معاونت کرسکتا تھا، اس کے نتائج یہاں موجود ہیں۔

''حرفِ آخر'' میں موصوف نے اپنے مطالعات کا عطر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حرف آخر ہمیشہ گمراہ کن ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں ساری باتیں سما نہیں سکتیں اور یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کلیدی امور درج ہونے سے نہ رہ جائیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے جو کچھ بھی اس باب میں لکھا ہے اسے رد نہیں کیا جاسکتا اور لازماً جس سے کچھ نہ کچھ روشنی ملتی ہے۔ آخر میں کتابیات کی فہرست درج ہے۔ اور یہ مفصل بھی ہے۔ جہاں کتابیں زیر بحث آئی ہیں وہاں اخبارات و رسائل کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ''اردو شاعری میں بہار کے ہندو شعرا کا حصہ'' ایک قابل لحاظ تحقیقی مقالہ ہے جو آج کی ضرورت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسے جلد سے جلد شائع ہونا چاہیے۔ ہندی میں اس کا ترجمہ ہو جائے تو اور بہتر ہے۔

میں ڈاکٹر اسرار احمد کو اس معتبر مقالے کے لیے مبارک باد دیتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ وہ ایسے موضوعات پر مزید تحقیقی کام سرانجام دیں گے۔

پروفیسر وہاب اشرفی
ہارون نگر، سکٹر ۲، پھلواری شریف، پٹنہ

مورخہ ۵/جنوری ۲۰۰۹ء

مقدمہ

مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار نے اپنے ایک مضمون ''اسلام اِن انڈیا''
میں لکھا ہے کہ:

''مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندستان کو بہت ساری نعمتوں
میں ایک بڑی نعمت زبان کی بھی ملی، جو ہندستان میں صحیح معنوں میں
Common language کہلانے کی مستحق ہے'' (الف ۱)۔

اور ڈاکٹر تاراچند کا قول ہے کہ:

''اٹھارھویں صدی تک ہندو مسلمان دونوں اردو کو اپنی
مشترک زبان سمجھتے تھے'' (الف ۲)۔

مذکورہ دونوں معتبر اور موقر شخصیتوں کا خیال بالکل صحیح ہے۔

زمانۂ قدیم میں متحدہ ہندستان میں فارسی کا چلن عام تھا۔ اس وقت یہاں کے لوگوں نے چاہے ہندو ہوں یا مسلمان یا کسی اور مذہب کے ماننے والے، فارسی زبان سیکھی اور اس زبان میں تصنیف اور تالیف کا کام کرنے کے ساتھ شعر و شاعری بھی کی۔ ایسے لوگوں کے ذکر سے کتب تواریخ و تذکرے کے اوراق بھرے پڑے ہیں، جنھوں نے فارسی زبان کی خدمت دل و جان سے کی۔ مسلمانوں کے دوش بہ دوش غیر مسلموں حتیٰ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے بھی فارسی اور پھر اردو کو اپنے افکار عالیہ اور قلبی احساسات کے ترجمان و اظہار کا ذریعہ بنایا۔

عہد مغلیہ میں فارسی دربار کی زبان ہونے کے ساتھ ملک میں سرکاری زبان کا بھی درجہ رکھتی تھی۔ فارسی کے علما اور فضلا و شعرا اور ادبا کو بڑے بڑے مناصب ملتے

تھے اور یہ بات عام تھی کہ فارسی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اس کے ذریعہ روزی روٹی کا معاملہ تو حل ہوگا ہی بلکہ یہ زبان معاشرے میں عزت وشرف اور وقار عطا کرنے میں بھی بڑی مددگار ثابت ہوتی تھی۔ لہٰذا لوگوں نے اس زبان کو سیکھا اور اس میں مہارت بہم پہنچانے کے بعد دربار میں اہم عہدے حاصل کیے۔ اس عمل میں ہندو یا مسلمان ہونا کوئی ضروری نہیں تھا۔ اصل چیز زبان کا واقف کار ہونا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پورے مغلیہ عہد میں ہندو اور مسلمان فارسی زبان کے ذریعہ ہی دربار تک رسائی حاصل کر سکے۔ بلکہ ہندستان سے باہر فارسی کے اپنے وطن ایران میں یہ شہرت تھی کہ ہندستانی حکمرانوں کے درباروں میں فارسی کے علما وفضلا اور شعرا و ادبا کی بڑی قدر ومنزلت ہوتی ہے۔ لہٰذا ایران سے علما، فضلا، شعرا، ادبا، حکما اور دیگر علوم وفنون کے ماہرین جوق در جوق ہندستان کا رُخ کرنے لگے اور یہاں مختلف درباروں میں ان کی پذیرائی ہونے لگی۔ ایک ایک شعر پر خزانوں کے دروازے کھول دیے جاتے اور جی بھر کر شاعروں کی قدردانی کی جاتی۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنی کتاب ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' میں ایسے بے شمار ہندوؤں کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے فارسی زبان میں علوم وفنون کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں لیکن جیسے جیسے مغلیہ سلطنت کا زوال ہوتا گیا، فارسی زبان کی رونق اور گرم بازاری ختم ہونے لگی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ انگریزوں نے ہندستان میں اپنے قدم جما لیے اور فارسی کو اسکولوں، دفتروں وغیرہ سے ختم کر کے اس کی جگہ انگریزی زبان کو دے دی اور وہ تمام مراعات جو فارسی کو حاصل تھی، انگریزی زبان کے حوالے کر دیے۔ نتیجے میں لوگوں کا رجحان اس طرف سے ہٹنے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آج فارسی کا نام ونشان ہی باقی رہ گیا ہے ورنہ اس زبان اور اس کے ادب کو ایک عام خیال کے مطابق قصۂ پارینہ کی حیثیت سے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ آج بہت کم شاعر یا ادیب اپنے افکار عالیہ کی

ترجمانی کے لیے فارسی زبان کو وسیلۂ اظہار بناتے ہوں گے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کو جس طرح پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی اور ہماری مشترکہ تہذیب و ثقافت و معاشرت میں جس طرح رخنہ اندازی کی، وہ اظہر من الشّمس ہے۔ اس سے ہماری قومی یکجہتی کو زبردست نقصان پہنچا۔ انھوں نے ہی ہمارے درمیان زبان کا جھگڑا کھڑا کیا اور مذہبی تعصّبات کو ہَوا دی۔ ہمارے ہم وطنوں کو زبان و تہذیب کے نام پر لڑا کر ہمارے درمیان پُر نہ ہونے والی خلیج پیدا کر دی ہے۔

ملک کے موجودہ حالات کے تناظر میں قومی یک جہتی اور برادران وطن کے مابین ہم بستگی اور ہم قدمی کی سخت ضرورت ہے۔ ادب خاص کر ہمارا اردو ادب اس سلسلے میں ہمیشہ پیش قدم رہا ہے۔ اردو نے جنگ آزادی اور قومی یک جہتی کو مستحکم کرنے میں جو رول ادا کیا ہے ویسا کردار کسی ہندستانی زبان نے ادا نہیں کیا ہے۔ اردو زبان کے شیدائیوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو شعرا و ادبا کی بھی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ جس طرح مجاہدین آزادی میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کی کثیر تعداد نظر آتی ہے۔

صحافت کا میدان ہو یا ادب کا یا شعر و شاعری کا، ہر جگہ ہمارے ہم وطنوں نے اپنی اردو دوستی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایسے ہندو شعرا کی فہرست تیار کرنا نہایت مشکل امر ہو گیا ہے، جنھوں نے اردو زبان میں اپنے افکار و خیالات کے لیے شعر و شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ تنہا منشی نول کشور اور ان کے پریس کی خدمات کو ہی لے لیجیے۔ منشی جی نے اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی ترویج و اشاعت کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں اور ان کے مشہور زمانہ اخبار ''اودھ اخبار'' نے اردو صحافت کی ترقی کی جو راہ ہموار کی ہے، ہندستان میں ویسی گراں بہا خدمات کسی اور پریس یا اخبار کے حصے میں نہ آسکیں، نہ ہی کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے

نے وہ کارنامے انجام دیے۔ ایسے ہندو شعرا، ادبا، قلم کاروں، فنکاروں، صحافیوں، مدیروں نیز مالکان مطبع کی فہرست پیش کرنا مشکل اور دشوار امر ہے جنھوں نے اپنے دل کا لہو دے کر چراغ اردو کو روشن اور فروزاں رکھا ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی نے لکھا ہے:

''مسلمانوں کے دورانِ حکومت میں جو ذریعے نام پیدا کرنے کے تھے، ان سب سے ہمارے بزرگوں نے ایک حد تک فائدہ اٹھایا۔ شعر و سخن کا مذاق جو کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں برابر جاری تھا، ہمارے بزرگوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ جب تک اردو زبان اپنی عہد طفولیت میں تھی اور فارسی کا رنگ چوکھا تھا، اس وقت ہماری قوم میں فارسی کے ایسے ایسے شاعر پیدا ہوئے کہ جن کی ذات پر ہر شخص کو ناز ہوسکتا ہے۔ ان کا کلام زمانہ کی ناقدردانی سے تلف ہوگیا لیکن جو اشعار اب تک سینہ بہ سینہ چلے آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عالی دماغوں نے شاعری کے فن میں کیا کمال حاصل کیا تھا اور شعر و سخن کو کیا معراج دی تھی'' (۳)۔

مذکورہ بالا بیان میں ''ہمارے بزرگوں'' اور ''ہماری قوم'' سے مراد اہل ہنود ہی ہیں اور واقعی چکبست کے بیان میں صداقت پائی جاتی ہے کیوں کہ اگر ہم ایسے ہندو شعرا اور ادبا کی شعوری طور پر فہرست بنانا چاہیں تب بھی نہیں بنا سکتے۔ پھر بھی مثال کے طور پر کچھ نام سرسری طور پر پیش کیے جارہے ہیں جس میں کسی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے بلکہ جو نام ذہن میں جیسے جیسے آتا گیا، لکھ دیا گیا ہے۔

مہاراجہ بینی بہادر لکھنوی، راجہ جسونت سنگھ پروانہ، ہردے رام جودت، راجہ نول رائے وفا لکھنوی، بال مکند حضور دہلوی، ٹیکا رام تسلی، بینی پرساد ظریف، درگا پرساد مضطرب لکھنوی، رائے بھکاری داس عزیز، راجہ رام نرائن موزوں عظیم آبادی، لالہ

اُجاگر چند الفت عظیم آبادی، کنور بہادر سنگھ گریاں، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق عظیم آبادی، مہاراجہ چندو لال شاداں، راجہ گردھاری پرساد باقی، کشن چندر گھوش راجہ جادو کشن شفق، ٹیک چند اخگر دہلوی، راجہ پیارے لال اُلفتی عظیم آبادی، راجہ بلونت سنگھ، کنور سکھراج بہادر رحمتی عظیم آبادی، راجہ درگا پرساد سندیلوی، گنگا داس ضمیر، مہاراج سنگھ عزیز، موہن لال منعم، گوبند رائے نصرت، جے سکھ لال خیال، پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی، پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی، رائے سرب سنگھ دیوانہ، سیتا رام عمدہ، منشی ہرگوپال تفتہ، چھنو لال دلگیر، دلّو رام کوثری، پیارے لال شاکر میرٹھی، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی دیبی پرساد بشاش، لالہ نہال چند لاہوری، بنی نرائن جہاں، منشی نیم چند کھتری، منشی جوالا پرساد برق، پنڈت مکند رام، اقبال ورما سحر، جگت موہن لال رواں، تربھون ناتھ ہجر، پنڈت بشن نرائن در، منشی درگا سہائے سرور، مہاراجہ کشن پرساد شاد، پنڈت میلا رام وفا، منشی نوبت رائے نظر، تلوک چند محروم، رام بابو سکسینہ، منشی پریم چند، منشی ونائک پرساد طالب بنارسی، منشی درگا پرساد اُفق، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری، آنند نرائن ملا، جگن ناتھ آزاد، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، بشیشر پرساد منور لکھنوی، اوپندر ناتھ اشک، گوپی ناتھ امن، کشمیری لال ذاکر، گلزار دہلوی، اوم پرکاش ساحر ہوشیار پوری، پرکاش پنڈت، بال مکند عرش ملسیانی، خوشتر گرامی، سکھ دیو پرساد بسمل الہ آبادی، نریش کمار شاد، ہربنس سنگھ دوست، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، راج نرائن راز، دیوان بریندر سنگھ ظفر پیامی، پنڈت سندر لال، مالک رام، ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر امرت لعل عشرت، کالی داس گپتا رضا، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر حکم چند نیّر، لالہ سری رام، امر چند قیس جالندھری، باوا کرشن گوپال مغموم، بلراج کومل، کرشن موہن، مہندر پرتاپ چاند، گلزار زتشی، گوپال متل اور پروفیسر گوپی چند نارنگ وغیرہ اور نہ جانے کتنے دانشوروں اور شعرا و ادبا نے اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دی ہیں اور دے

رہے ہیں۔ یہ سب اپنی خدمات کے سبب آسمان اردو پر آفتاب و ماہتاب کی طرح ہمیشہ روشن و تابندہ رہیں گے۔

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ میری کیا بساط جوان تمام اہل ہنود کی فہرست نویسی کر سکوں جنھوں نے ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک کے گوشہ و کنار میں اردو کا چراغ جلایا اور اب بھی جلائے ہوئے ہیں اور اسے روشن اور تابناک رکھنے کی بساط بھر کوشش بھی کرتے رہتے ہیں اور امید ہے کہ یہ عمل اسی جوش و خروش سے جاری و ساری رہے گا۔

رام بابو سکسینہ کا شاہکار کارنامہ ان کی ''تاریخ ادب اردو'' ہے۔ یہ کتاب جسے انھوں نے انگریزی میں تالیف کیا تھا آج تک اپنے موضوع کے اعتبار سے حوالے کا کام دیتی ہے۔ اس کی تالیف کا مقصد اگرچہ غیر اردو دانوں کو اردو زبان و ادب سے واقف کرانا تھا، جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن یہ کتاب ہمارے لیے بھی اتنی ہی مفید اور سود مند واقع ہوئی جتنی کہ غیروں کے لیے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر مرزا محمد عسکری نے اسے اردو کا جامہ پہنایا اور مطبع منشی نول کشور نے اسے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا تھا۔

یہی وہ پس منظر ہے جو طالب علمی کے زمانے سے میرے ذہن میں بسا ہوا تھا لہٰذا میں نے اردو کے لیے ہندوؤں کی خدمات سے متعلق کئی کتابوں کا مطالعہ کیا خاص کر صوبۂ بہار کے تناظر میں ایسے ہندو شعرا کی بابت تذکروں میں پڑھا، جنھوں نے اس ریاست میں اردو شاعری کا چراغ جلائے رکھنے میں اپنے ہم عصر مسلم شعرا سے کسی طرح کم خدمت انجام نہیں دی تھی، لہٰذا میں نے طے کیا کہ اس موضوع پر زیادہ دل جمعی اور اطمینان سے کام کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں اپنے شفیق اور ہر دل عزیز استاد پروفیسر عبد الواسع صاحب سابق صدر شعبۂ اردو، بی.آر.اے. بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے جن سے میں نے ایم.

اے۔ میں پورے دو سال پڑھنے کی سعادت بھی حاصل کی تھی، جب مشورہ کیا تو موصوف نے مجھے موضوع کی نزاکت اور وسعت کے پیش نظر ''بہار کی شاعری میں ہندوؤں کا حصہ'' جیسے کسی موضوع پر پی ایچ.ڈی. کے تحقیقی مقالے کے لیے کام کرنے کی صلاح دی اور اس طرح ''بہار کی اردو شاعری اور ہندو شعرا'' میرے پی ایچ.ڈی. کے تحقیقی مقالے کا موضوع منتخب فرمایا۔ پھر کچھ کتابوں کی نشاندہی بھی فرمائی۔

پس منظر کے طور پر میں نے اس باب میں آغاز سے لے کر موجودہ دور کے نمائندہ شعرا کے مطالعے کو پیش کیا ہے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ بہار کی اردو شاعری، دکن کی شاعری کے متوازی ہے۔ وہاں سلاطین گول کنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں یہ پروان چڑھ رہی تھی تو سرزمین بہار میں صوفیا و مشائخ اس کے سر پر دست شفقت پھیر رہے تھے۔ خاص کر پھلواری شریف کے صوفی شعرا نے اردو شاعری کی ابتدا میں جس طرح کشادہ دلی سے اسے فروغ دینے کی کوشش کی اس جیسی کہیں اور مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ پھلواری شریف اور عظیم آباد نیز اس کے اطراف کے مقامات کے صوفی شعرا کے تذکرے کے ساتھ کچھ اور شعرا کا ذکر بھی کیا گیا ہے، جنھوں نے بہار میں اردو شاعری کی روایت کو مستحکم کرنے اور آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لیکن یہاں اس بات کا شعوری طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ صرف مسلم شعرا کو ہی موضوع سخن بنایا جائے کیوں کہ دوسرا باب ہمارا اصل موضوع ہے، جس میں غیر مسلم شعرا کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ بہار میں اردو شاعری کے آغاز و ارتقا کی بحث میں ہم نے جن قدیم و جدید شعرا کا ذکر کیا ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی، سید عماد الدین پھلواروی، ملاّ محمد علیم تحقیقؔ، میر باقر حزیںؔ، قاضی عبدالغفار، اشرف علی فغاںؔ، شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی، غلام نقشبند سجاد، شاہ آیت اللہ جوہریؔ، مفتی غلام ثروتؔ، شیخ محمد عابد دلؔ، شیخ محمد روشن جوششؔ، شیخ نور الحق تپاںؔ، راسخؔ عظیم آبادی، امان علی ترقیؔ، شاہ ظہور الحق ظہورؔ، سید ابوالحسن فردؔ

پھلواروی، ابو تراب آشنا، حسرت عظیم آبادی، امداد امام اثر، حضرت صوفی منیری، صفیر بلگرامی، اکبر داناپوری، شاد عظیم آبادی، عرش گیاوی، احقر مظفرپوری، یگانہ چنگیزی، احقر بہاری، شوق نیموی، مشرقی منیری، مبارک عظیم آبادی، شفق عماد پوری، ریاض حسن خاں خیال، قوس حمزہ پوری، تمنا عمادی، سریر کابری، قتیل داناپوری، علامہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی، اجتبیٰ رضوی، یوسف سیوانی، جذب گوپال پوری، کلیم عاجز، نادم بلخی، ناوک حمزہ پوری، پروفیسر طلحہ رضوی برق، مظہر امام، عبدالمنان طرزی، جوہر سیوانی، کوثر سیوانی، قمر سیوانی، مختار احمد عاصی، شکیل احمد معین، امتیاز رامپوری، ضیاء قطبی اور فہیم جوگاپوری۔

ظاہر ہے اس مختصر سے جائزے میں قدیم و جدید شعرا میں بہتیرے شعرا کا ذکر یہاں آنے سے رہ گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب قطعی نہ لیا جائے کہ ایسے حضرات کی بہار کی اردو شاعری میں خدانخواستہ کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ اسے میری کوتاہی پر محمول کیا جائے کیوں کہ اگر میں آغاز سے اب تک کے تمام شعرا کا تذکرہ کرنے لگتا تو شاید اپنے اصل موضوع سے انصاف کرنا میرے لیے مشکل ہو جاتا۔ میں ان تمام حضرات سے دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں جن کا ذکر خیر اس مختصر سے تاریخی پس منظر میں نہ آسکا لیکن میں ان کی قدر و قیمت کا قائل ضرور ہوں۔

پہلا باب کتاب کا اصل موضوع ''اردو شاعری میں بہار کے ہندو شعرا کا حصہ'' ہے اور اس کا پہلا باب ''بہار کے ہندو شعرا'' ہے۔ بہار کی اردو شاعری میں ہندو شعرا نے جس طرح اپنا کردار ادا کیا ہے وہ اہل کتاب سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن ان کی خدمات کے جائزے پر کوئی مستقل مطالعہ ضروری تھا اسی لیے حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ اپنے موضوع سے انصاف کیا جاسکے۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس موضوع سے میں نے انصاف کیا ہے یا بہار کے تمام ہندو شعرا کا ذکر کر دیا گیا ہے کیوں کہ بہت سارے شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جن کا اگر نام ملتا ہے تو کلام نہیں ملتا اور اگر کلام ملتا ہے تو حالات پر زمانے کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اپنے مطالعے کی آسانی کے لیے اس

موضوع کو تین ادوار:

(۱) متقدمین
(۲) متوسطین اور
(۳) متاخرین

میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر دور کے شعرا کی ترتیب ان کے نام یا تخلص کے اعتبار سے حروف تہجی پر رکھی گئی ہے تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو مورد نظر شاعر کے بارے میں آسانی ہو سکے۔ اس سلسلے میں ہمارے پیش نظر فصیح الدین بلخی مرحوم (م:۱۹۶۲ء) کا تذکرہ ''ہندو شعرائے بہار'' پہلے سے نقش اوّل کی حیثیت سے موجود تھا۔ انھوں نے بھی اپنے تذکرے میں اسی ترتیب کو مدنظر رکھا ہے۔

متقدمین کے تحت آغاز سے ۱۲۰۰ھ تک کے ۲۲ شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ متوسطین کے ذیل میں ۱۲۰۱ھ سے ۱۳۰۰ھ تک ۴۷ شعرا اور متاخرین میں ۱۳۰۱ھ سے اب تک کے ۹۰ شعرا کو جگہ دی گئی ہے۔

دوسرا باب بہار کے 'اہم ہندو شعرا کی شاعری کا تنقیدی جائزہ' ہے۔ اس باب کے تحت میں نے کوشش کی ہے کہ ہر دور سے کچھ ایسے شعرا کا انتخاب کر سکوں جن کی خدمات اردو شاعری کے لیے نمایاں رہی ہیں۔ ایسے شعرا میں لالہ اجاگر چند الفت عظیم آبادی، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق عظیم آبادی، راجا رام نرائن موزوں عظیم آبادی، رائے بھوانی پرساد آزاد عظیم آبادی، کملا پرساد عاجز، منشی کیولا پرساد فقیر مظفر پوری اور چند دوسرے شعرا شامل ہیں۔

تیسرا باب ''اردو شاعری میں بہار کے ہندو شعرا کا حصہ'' ہے۔ اس باب میں میں نے بہار کی اردو شاعری کے فروغ میں اجتماعی طور پر ہندو شعرا کے کردار سے بحث کی ہے اور اس بات کا بادلِ ناخواستہ اعتراف بھی کیا ہے کہ گزشتہ صدی کے بعد بہار میں ہندو شعرا میں اردو شاعری کے سلسلے میں وہ جوش و جذبہ کم نظر آ رہا ہے جو پہلے یا ماضی

قریب کے شعرا میں دیکھنے میں آتا تھا۔ آپ اسے حالات کے تناظر میں دیکھیں تو میری بات سے اتفاق کریں گے کیوں کہ اب اردو کو ایک مخصوص قوم کی زبان کا نام دے کر ہمارے ہم وطنوں کے اذہان میں یہ گمراہ کن بات بٹھا دی گئی ہے کہ اردو بھارت کی زبان نہیں بلکہ یہاں کے مسلمانوں کی زبان ہے۔ ایسے عالم میں بھی چند ہندو شعرا اس ریاست میں اب بھی موجود ہیں اور اس زبان میں شاعری کر رہے ہیں۔ لٰہذا ان کی ہمہ جہت حوصلہ افزائی ہمارا فرض ہے۔ میں نے بھی حوصلہ افزائی کے طور پر ہی ان کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے۔

چوتھا باب 'حرفِ آخر' کے عنوان سے ہے، جس میں گزشتہ چاروں ابواب کا حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موجود دور میں ہندستان کی سطح پر تو ہندو شعرا اور ادبا میں اردو کے سلسلے میں دلچسپی نظر آرہی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے صوبے میں گنے چنے ہندو شعرا ہیں جو شاعری کا چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں ورنہ بحیثیت مجموعی ہندوؤں میں اب اردو شاعری سے دلچسپی کا فقدان نظر آتا ہے۔

پانچواں باب 'کتابیات' کے لیے مختص ہے۔ جس میں مذکورہ کتاب کی تحریر میں جن معاون کتابوں/ رسالوں وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی حروف تہجی کے اعتبار سے ایک فہرست شامل کر دی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ مطبوعہ کتابوں/ رسالوں کا مقام اشاعت اور سنہ اشاعت ضرور درج کیا جائے۔

آخر میں اپنے شفیق استاد پروفیسر عبد الواسع صاحب کا شکریہ ادا کرنا لازم سمجھتا ہوں کہ موصوف نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ محترم جناب ڈاکٹر سید علی عباس صاحب کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو شاید میں اس لائق نہ ہوسکتا کیوں کہ تعلیمی دور سے لے کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایوارڈ ہونے تک آپ نے بھرپور تعاون کیا، جس کے لیے ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

والد الطاف حسین (مرحوم)، والدہ محترمہ سلمٰی خاتون، چچا محمد رضا (مرحوم)،

برادران: دلدار حسین، اظہار حسین، اقبال حسین، اساتذہ، اہلیہ انجم نسرین، بچے ارشد اسرار و آصف اسرار و میرے خسر پروفیسر ڈاکٹر سرفراز اکرم سابق صدر شعبۂ کامرس، ایل. این. متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ، خوش دامن صاحبہ نور جہاں اکرم، دربھنگہ، ڈاکٹر معراج اکرم (بابو)، دربھنگہ اور میرے تمام اہل خانہ، احباب اور تمام محسنوں کے لیے اپنی ممنونیت کے احساس کے باوجود شکریہ ادا کرنے سے گریز کر رہا ہوں اس لیے کہ مجھے ان کی محبت عزیز ہے اور یہ مختصر لفظ 'شکریہ' ان کے بے پایاں مہر و خلوص کا بدل نہیں ہوسکتا۔

اس سلسلے میں عزیز دوست ڈاکٹر سید حسن عباس کا جو اب شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی میں مشغول کار ہیں، انتہائی مشکور ہوں کہ اپنی علمی و ادبی مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر اور اپنے کتب خانے کی کتابوں کے ذریعہ جس فراخ دلی سے میری مدد کی اس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ اس سلسلے میں مجھے جتنی کتابوں کی ضرورت پیش آئی تقریباً وہ سب کی سب ان کے کتب خانے ''مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور'' میں مل گئیں۔ علاوہ ازیں جب بھی اور جہاں کہیں کوئی دشواری پیش آئی، اسے بھی انھوں نے دور کرنے میں بھرپور دلچسپی دکھائی۔ ان کے اس عملی تعاون کے لیے میں ہمیشہ ان کا ممنون رہوں گا۔

سیوان کے جن شعرا مثلاً پانڈے رامیشوری پرساد عرف چھوٹے بابو وکیل اور سنیل کمار تنگ عنایت پوری کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے ساتھ تعاون کیا اور اپنے حالات اور کلام مرحمت فرمائے۔

امید ہے کہ یہ کتاب ارباب حل و عقد اور صاحبان نظر ہمدردانہ نگاہ سے دیکھیں گے اور اگر کچھ خامیاں نظر آئیں تو اسے میری کوتاہی، ناتجربہ کاری اور کم سوادی پر محمول کریں گے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازیں گے تاکہ اس میں مناسب

ترمیم کر کے اسے سود مند بنا سکوں۔

جناب فیض اکرم، سابق (آئی. اے. ایس.) پٹنہ، ڈاکٹر شفیق عالم، پرنسپل نتیشور کالج، مظفر پور، جناب خالد حمید (انجینئر ریلوے، کانپور)، ڈاکٹر اکرام الدین، پٹنہ، نثار احمد (ضلع کوآپریٹو آفیسر، کٹیہار)، محمد محسن (آئی. اے. ایس.) کرناٹک، ڈاکٹر ہارون شیلندر، صدر شعبۂ ہندی، زیڈ.اے. اسلامیہ کالج سیوان، ڈاکٹر صفدر امام قادری، صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ، ڈاکٹر امام اعظم (مانو)، دربھنگہ، ڈاکٹر ظفر کمالی، ڈاکٹر زاہد سیوانی، ڈاکٹر کرشن موہن جیسوال، ڈاکٹر انیل کمار سریواستو، ڈاکٹر سمیع احمد (صدر شعبۂ اردو وِدّیا بھون مہیلا کالج، سیوان) اور ملیح احمد خاں کا بھی شکریہ ادا کرنا لازمی ہے۔ ان حضرات کی نیک خواہشات شامل حال نہ ہوتیں تو شاید میں اس کام کو انجام نہ دے پاتا۔

واضح رہے کہ موجودہ حالت میں اس کتاب سے اس کا پہلا باب 'بہار میں اردو شاعری کا آغاز و ارتقا' طوالت کے خوف سے حذف کر دیا گیا ہے۔

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

اسرار احمد

سیوان

یہ ایک گراں قدر کتاب ہے۔ اس میں بہار کے غیر مسلم شعرا سے بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی نگاہیں نہ صرف وَا ہیں بلکہ وہ ادبی منظر نامے سے بھی باخبر ہیں۔ اس موضوع پر پہلے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان پر بھی ان کی نگاہ ہے۔ غیر مسلم شعرا پر تحقیق ہوتی رہی ہے لیکن اردو شاعری کی ابتدا سے تا حال کی صورتحال اب تک سامنے نہیں آئی ہے۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ تحقیق کی نوعیت بے حد منفرد اور معیاری ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جو نکات پیش کیے ہیں ان میں منطقی استدلال ہے۔ کوئی بات غیر مستند نہیں۔ اسلوب بیان پختہ ہے۔

امید قوی ہے کہ یہ کتاب ہر سطح پر پسند کی جائے گی۔

⊙ ڈاکٹر ہمایوں اشرف

باب اوّل

بہار کے ہندو شعرا

(الف) شعرائے متقدمین

آغازِ سے ۱۲۰۰ھ تک

الفت، لالہ اُجاگر چند

لالہ مہابلی کے فرزند لالہ اُجاگر چند اُلفتؔ کی عظیم آباد میں سکونت تھی۔ عزیز الدین بلخی رازؔ عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''الفتؔ، لالہ اُجاگر متوطن عظیم آباد، قوم کائستھ ماتھر۔ پہلے غربت تخلص کرتے تھے۔ دام الفت میں گرفتار ہو کر الفت تخلص اختیار کیا۔ میر محمد علیم تحقیقؔ سے تلمذ تھا۔ نہایت قناعت اور خوش دلی کے ساتھ معاش قلیل میں بسر اوقات کرتے تھے۔ فارسی نظم و نثر دونوں میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ دیوان فارسی کا مرتب تھا'' (۱)۔

رازؔ عظیم آبادی نے اُلفت کا ایک فارسی شعر نقل کیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر اخترؔ اورینوی نے اپنی کتاب 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا' میں لکھا ہے کہ:

''پروفیسر حسن عسکری نے لالہ اُجاگر چند کا تخلص 'الفت' اور 'غریب' بتایا ہے اور لکھا ہے کہ 'ممکن ہے املا کی مشابہت کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہوا ہو''۔

پروفیسر حسن عسکری نے لالہ اُجاگر چند الفت کے مجموعۂ مکتوبات 'انشائے غریب' (فارسی) پر ایک مفصل مضمون 'معاصر' پٹنہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں لکھا تھا اور الفتؔ کی ایک اردو غزل کا تعارف کرایا تھا۔ یہ غزل ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی کتاب میں درج کی ہے، جو یہ ہے:

خلوت نشین غم کوں تماشا سین کام کیا
مخمور جام عشق کو صہبا سین کام کیا

دیوانۂ محبت بے اختیار کون
تکلیف حال صحبت دانا سین کام کیا

مست مئے الست کو ہے تشنۂ دگر
جامِ شراب کہنہ و مینا سین کام کیا

پروردہ آفتاب محبت کون روز حشر　　باغ نعیم و سایۂ طوبیٰ سین کام کیا
جس کو ہے داغ سینہ و آتش تمام دل　　سیر گل و تفرج لالہ سین کام کیا(۲)

یارب غریبؔ ملک معانی کو رہنما
شکل مہیب وصورتِ زیبا سین کام کیا

اخترؔ اورینوی نے اس غزل کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اس میں فارسیت کا غلبہ ہے۔ بعض مصرعوں میں کاتب کا تصرف معلوم ہوتا ہے اور اس وجہ سے ناموزونیت جابجا ملتی ہے''(۳)۔

بہار کے متقدمین شعرائے ہنود میں الفتؔ ایک اہم شاعر گزرے ہیں۔ اگر ان کا ریختہ (اردو) کا کلام دستیاب ہو جائے تو بڑی اہم بات ہوگی۔

مذکورہ غزل کے بارے میں فصیح الدین بلخی نے لکھا ہے کہ میں نے الفتؔ کے پہلے تخلص غربتؔ یا غریبؔ کی بابت تصدیق کے لیے جب کے. پی. جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں 'انشائے غریب' کے مخطوطے دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے مخطوطے میں غزل نظر نہیں آئی۔ اس سلسلے میں پروفیسر حسن عسکری صاحب سے جب انھوں نے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ جس وقت یہ مخطوطہ فروخت کے لیے آیا تھا۔ اُس وقت وہ اوراق اس میں موجود تھے۔ جن سے میں نے یہ غزل نقل کی تھی، ممکن ہے بعد میں جلد بندی وغیرہ میں ضائع ہو گئے ہوں۔ لیکن ایک بات ثابت ہوگئی اور وہ یہ کہ الفتؔ کا پہلا تخلص غریبؔ ہی تھا غربتؔ نہیں، جیسا کہ راز بلخی نے لکھا ہے(۴)۔

الفتؔ، منشی منگل سین

عظیم آباد کے رہنے والے، قوم کائستھ، جرأت دہلوی کے شاگرد تھے۔ تذکرہ سرور کے مطابق دہلی میں کسی عہدے پر کام کرتے تھے۔ اور علی ابراہیم خاں

نے لکھا ہے کہ آرزو کے ہم عصر تھے (۵)۔

نمونۂ کلام

اس طرح چھپ چھپ کے گھر جاؤ گے گر دو چار کے
مفت میں ہو جائیں گے برباد گھر دو چار کے

ہر قدم پر یاں تلک آنے میں سو سو ناز ہیں
کیوں کہ گھر جانے لگے شام وسحر دو چار کے (۶)

بہادر، راجا بنی بہادر

بقول فصیح الدین بلخی:

''عالم گیر ثانی اور شاہ عالم ثانی کے عہد میں صوبۂ بہار کے راجاؤں اور ناظم بہار کے معتمدوں میں تھے۔ تذکرہ عمدۂ منتخبہ مولفہ اعظم الدولہ سرور نمبر ۳۶۱ مملوکہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ان کا ذکر یوں ہے:

بہادر تخلص راجہ بنی بہادر از راجگان صوبۂ بہار است، ازوست ؎

سیاہی مو کی گئی دل کی آرزو نہ گئی
ہمارے جامۂ کہنہ سے مئے کی بو نہ گئی

تذکرہ سخن شعرا میں بھی ان کا یہی ایک شعر پایا جاتا ہے۔ کنور جسونت سنگھ پروانہ انھیں کے بیٹے تھے'' (۷)۔
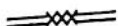
بیتابؔ، سنتوکھ رائے

عظیم آباد کے باشندہ تھے۔ نازک مزاج اور مطالعۂ کتب کے شوقین بھی۔ تذکرہ عشقی، تذکرہ میر حسن اور تاریخ شعرائے بہار نیز تذکرہ ہندو شعرائے بہار میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا کسی کو گرفتارِ زلف کا نہ کرے
نصیب میں کسی کافر کے یہ بلا نہ کرے (۸)

تذکرۂ میر حسن سے تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے مؤلف نے ان کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں، جو یہ ہیں:

محبت کی بھی کچھ ہوتی ہیں کیا اے ہم نشیں راہیں
کہ خوباں یوں ہمیں دکھ دیں ہم ان کو اس طرح چاہیں

ادھر نالہ کیا اُودھر وہ مضطر ہو چلا آیا
عجب دن تھے وہ جن روزوں میں رکھتی تھیں آہیں

محبت اب تلک رکھتی ہے یہ تاثیر مجنوں کی
کہ بن لیلیٰ کہیں کھنچتی نہیں تصویر مجنوں کی

نہ رہے باغِ جہاں میں کبھی آرام سے ہم
پھنس گئے قید قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

اپنے مذہب میں ہے اک شرط طریقِ اخلاص
کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

سبزے پہ اس کے خط کے نہ مارا گیا میں ایک
اس گل زمیں میں کھیت ہزاروں جواں رہے

جی میں ہے اس کی بات میں اب پھر نہ بولیے
لیکن کسی طرح جو یہ کافر زباں رہے

میں کیا خلل نہ اٹھائے فلک کے کینے سے — کسی کو کام نہ ڈالے خدا کمینے سے
تو اپنا دل سا مرا دل نہ سمجھیو بے رحم — کہ سنگِ سخت کو کیا نسبت آبگینے سے

رباعی:

یاں آ کے ہم اپنے مدعا کو بھولے — مل مل کے غیروں سے آشنا کو بھولے
دنیا کی تلاش میں گنوائی سب عمر — اس مس کی طلب میں کیمیا کو بھولے(۹)

بیدارؔ، منشی بساون لال

مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ ایک مدت تک پٹنہ میں مقیم تھے اور یہیں وفات پائی۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

مرے لخت جگر یوں آنسوؤں کے ساتھ جاتے ہیں
کہ جوں پھولوں کی پنکھڑی لے کے پانی میں بہاتے ہیں(۱۰)

ہے تیرے سوا کون مرا پوچھنے والا
ہاں تجھ کو سلامت رکھے اللہ تعالیٰ(۱۱)

تذکرہ شورشؔ اور تذکرہ عشقیؔ میں ان کا مختصر ذکر ملتا ہے۔ فارسی اور ریختہ میں شعر کہتے تھے۔
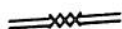
تحقیق، دیوان جیون رام

تحقیق، لالہ کرپا رام کے صاحبزادے، موضع شیودھا ضلع مظفرپور کے باشندہ تھے۔ یہ قوم کے کائستھ اور ان کا خاندان معزز و محترم خاندان تھا۔
تحقیق کو عربی و فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ مرزا محمد علی فدوی سے شرف تلمذ تھا۔ شاداں فاروقی نے فارسی کا ایک شعر نقل کیا ہے(۱۲)۔ ان کا اردو کلام نہیں ملتا۔

═══

خاکستر، منشی سب سکھ

راجہ رام نرائن موزوں عظیم آبادی کے بھائی تھے اور محمد فقیہ دردمند کے شاگرد۔ عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی نے ان کا فارسی کا ایک ہی شعر درج کیا ہے(۱۳)۔

بہار کرد گل عارض عرقنا کش
نگہ بہ چشم تماشا ز شوق لبریز است

یہی شعر تذکرہ ہندو شعرائے بہار میں بھی ملتا ہے۔

═══

دل عظیم آبادی، منشی بنی پرساد

منشی بنی پرساد دل عظیم آبادی منشی دبی پرساد کے صاحبزادے اور راسخ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کے دو اشعار یہ ہیں:

پردہ اٹھا کے تو نے ادھر کو گزر کیا
عالم کے دل میں تیری محبت نے گھر کیا

دل چاہتا ہے بولیے ہرگز نہ یار سے
پر بس نہیں چلے ہے دل بیقرار سے (۱۴)

═══xxx═══
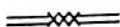
ذوقؔ، منشی آسا رام

ذوقؔ، رائے منسا رام کے بھائی تھے جو محلّہ بھگوان داس، دربھنگہ میں رہتے تھے اور راجہ رام نرائن موزوںؔ عظیم آبادی کی صوبیداری کے زمانے میں ترہت کے فوجدار تھے۔ ذوقؔ پرگنہ چاونڈ ضلع دربھنگہ کے چودھری تھے۔ کچھ دنوں عظیم آباد بھی قیام کیا تھا لیکن ملازمت کی وجہ سے زیادہ تر کلکتہ میں رہتے تھے۔ منشی آسا رام ذوقؔ، مرزا محمد علی فدویؔ کے شاگرد تھے۔ ایک شعر میں اس کا اعتراف بھی کیا گیا ہے(۱۵)۔

کیوں نہ ہو شعر کا رتبہ مرے اے ذوقؔ بلند
فدوی ہو کر رہے فدویؔ سے استاد کے ساتھ

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

وہ نظر مجھ کو جب نہیں آتا　　کچھ نظر مجھ کو تب نہیں آتا

———

دل چاہتا ہے تیرے ہوا خواہ کا اسے　　شعلہ کی طرح رات جو کچھ اضطراب تھا

———

ذوقؔ کے مرنے کا افسوس نہیں کچھ اس کو　　غم کہاں شمع کے دل میں کسی پروانے کا

———

درد دل کہنے نہ پائے آج ہی　　بیٹھتے ہی یار تو اُکتا گیا

———

باغِ دنیا میں اب مجھے یارو
نہ غرض گل سے ہے نہ خار سے کام

دلِ پُر داغ کی کروں ہوں سیر
نہ خزاں سے نہ کچھ بہار سے کام

═══xxx═══

رآجا، راجا بہادر

والد کا نام مہاراجہ شتاب رائے۔ اشرف علی فغاں متوفی (۱۱۸۶ھ) سے شرف تلمذ تھا۔ ان کا ذکر تذکرہ عمدۂ منتخبہ، تذکرہ سخن شعرا اور تاریخ شعرائے بہار میں ملتا ہے۔ ایک شعر یہ ہے:

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے
ہم ان تلک نہ پہنچے وہ ہم تلک نہ پہنچے (۱۶)

═══xxx═══
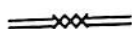
رقیم ندروی، منشی گرسہائے

والد کا نام منشی نور نرائن لال۔ موضع ندرہ ضلع گیا کے رہنے والے۔ اردو شاعری میں ناسخ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اردو کے علاوہ عربی فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ اردو کلام نہیں ملتا لیکن ان کا فارسی کا ایک شعر یہ ہے:

در چمن وا اگر این عقدۂ گیسو گردد
غنچہ گرہ نافۂ آہو گردد (۱۷)

═══xxx═══

رنگین، منشی بلاس رائے

راجا امان رائے کے فرزند عظیم آباد میں سکونت رکھتے تھے اور راجہ رام نرائن

موزوںؔ عظیم آبادی کے احباب میں تھے۔ یہ قوم کے کائستھ سری واستو تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں وفات پائی۔ عزیز الدین بلخی رازؔ عظیم آبادی نے ان کے فارسی کے دو اشعار نقل کیے ہیں (۱۸)۔ تذکرۂ عشقی کے حوالے سے فصیح الدین بلخی نے ان کا اردو کا ایک شعر درج کیا ہے:

اس مصیبت میں جو تو گھر سے نکالے ہے مجھے
یہ تو بتلا میں بھلا جاؤں کدھر آخر شب (۱۹)

شاداںؔ، لالہ بساون لال (۲۰)

پٹنہ میں سکونت تھی۔ وہاں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ نظم و نثر میں مہارت رکھتے تھے۔ صاحبِ تذکرۂ شورش کے بقول اچھے انشاپرداز تھے اور بقول سرور دہلی میں رہتے تھے۔

شوقؔ، شیوگوپال

شیوگوپال عرف کاکا جی نام، تخلص شوقؔ عظیم آباد میں رہتے تھے۔ والد کا نام مہاجن سوداگرمل تھا۔ تجارت کا شغل تھا۔ نوجوانی میں وفات پائی (۲۱)۔

نمونۂ کلام یہ ہیں:

دامن کو تیرے خوں نہ رہے بن بھرے ہوئے
چھوٹے نہ اپنا عشق تو قاتل مرے ہوئے (۲۲)
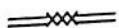
شورشؔ عظیم آبادی، مکند لال

عظیم آبادی کے محلّہ دیوان میں رہتے تھے اور کائستھ تھے۔ اردو اور فارسی میں ان کی ایک ضخیم مثنوی ہے جو نایاب ہے۔ اردو مثنوی کا ایک شعر یہ ہے:

کبھی میرا پٹنہ بہشت بریں تھا
جواب اس کا دنیا کے اندر نہیں تھا (۲۳)

═══xxx═══

عاشقؔ، مہاراجا کلیان سنگھ (۲۴)

مہاراجا شتاب رائے کے بیٹے۔ ۱۱۶۵ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۸۷ھ میں ان کے والد نے وفات پائی تو یہ باپ کے خطابات اور ۵۰ ہزار سالانہ تنخواہ پر ان کی جگہ نائب دیوان صوبہ بہار مقرر ہوئے۔ جب ان کی مالی حالت بگڑ گئی تو یہ عظیم آباد سے کلکتہ چلے گئے۔ کافی عرصہ تک وہاں مقیم رہے۔ پھر ۱۲۱۸ فصلی میں عظیم آباد آئے۔ ۱۲۲۷ھ میں یا اس کے بعد پٹنہ میں وفات پائی۔

مہاراجا کلیان سنگھ عاشقؔ کی تعلیم و تربیت زمانے کے رواج کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم سے ہوئی تھی۔ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب انھوں نے بہت جلد علوم متداولہ سے خود کو آراستہ کر لیا۔ حدیث، فقہ، قرآنیات اور دیگر اسلامی علوم و فنون میں کافی مہارت پیدا کر لی جس کا اعتراف کلیان سنگھ عاشقؔ نے اپنی مثنویوں میں کیا ہے، کلیان سنگھ عاشقؔ کے گھریلو ماحول پر روشنی ڈالتے ہوئے۔

ڈاکٹر منصور عالم نے لکھا ہے:

''اگرچہ مہاراجا موصوف کی پیدائش ہندو گھرانے میں ہوئی جو نسلاً کائستھ تھے لیکن ان کی پرورش و پرداخت بالکل اسلامی

ماحول میں ہوئی تھی اس لیے اسلامی تہذیب و تمدن نے ان کے دل و
دماغ پر گہرا اثر مرتب کیا تھا۔ وہ عقائد کے لحاظ سے صوفی منش اور
موحد تھے۔ اسلامی تعلیم نے ان کو اسلام سے بالکل قریب کر دیا تھا۔
انھوں نے قرآن پاک کی چند آیات کی جو منظوم تفسیر لکھی ہے وہ اس
بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اسلامیات میں ان کو کافی دخل تھا" (۲۵)۔

پیغمبر اکرم ﷺ، ائمہ طاہرین اور اہل بیت اطہار علیہم السلام سے انھیں گہری عقیدت تھی۔ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے انھیں خانوادۂ پیغمبر اطہر ﷺ کا والہ و شیدائی بتایا ہے۔ ان کے بیشتر قصائد حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ، ائمہ اور بزرگانِ دین کے شان میں ہیں۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی قدرت رکھتے تھے۔

قاضی عبد الودود نے تذکرہ مسرت افزا کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

"رسول اور اہل بیت سے (انھیں) فطری محبت ہے۔ ہر
وقت امیر المومنین کا دم بھرتے ہیں اور اپنے کو مومنین اور خاندان
رسالت کے فدائیوں میں شمار کرتے ہیں"۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ نماز بھی پڑھتے تھے اور روزہ بھی رکھتے تھے۔ یہ بات بھی مشہور تھی کہ مہاراجا کلیان سنگھ عاشق شیعی عقائد رکھتے تھے اور محرم میں تعزیہ داری بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ صاحب تذکرہ تاریخ شعرائے بہار نے لکھا ہے:

"ان کے والد نے حضرت شاہ عالم بادشاہ سے سند دیوانی
حاصل ہونے کے بعد عظیم آباد میں اقامت اختیار کی اور کلکتہ میں
سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے خطاب مہاراجگی کے ساتھ منصب
نظامت صوبۂ بہار سے سرفراز ہوئے۔ اگرچہ یہ بھی (عاشق) اپنے
باپ ہی کی مانند مجمع کمالات تھے لیکن راحت طلب اور عیش پسند

ہونے کے باعث اس خدمت جلیلہ پر ان کی جانشینی سے جی چرا کر صہباء لعل رنگ اور معشوقان شوخ و شنگ کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ سوائے فکر شعر کے اور کسی دردسر کو مول نہ لیا"(۲۶)۔

فصیح الدین بلخی نے تذکرہ ہندو شعرائے بہار میں لکھا ہے:

"کلیان سنگھ اپنے باپ کی طرح شعرا اور ادیبوں کے قدردان ہونے کے علاوہ بذات خود تواریخ، شاعری اور ادب میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ مثنوی زیبا، حبیب السیر مدح ائمہ اطہار اور اس کے علاوہ خلاصۃ التواریخ اور واردات قاسمی یادگار چھوڑیں۔ یہ سب کتابیں فارسی میں ہیں"(۲۷)۔

عزیز الدین بلخی رازؔ عظیم آبادی کلیان سنگھ عاشقؔ کے قلمی آثار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک دیوان اور مثنوی مسمّٰی بہ زیبا، حبیب السّیر اور مدح ائمۂ اطہارؑ میں دس ہزار ابیات یادگار چھوڑے"(۲۸)۔

کلیان سنگھ عاشق کے بارے میں پروفیسر سید حسن عسکری نے ایک مقالہ ندیم گیا کے بہار نمبر (۱۹۴۰ء) میں لکھا تھا جس میں انھوں نے ان کے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ کلیان سنگھ کے والد اوصاف حمیدہ کے مالک تھے اور بڑے ہی اخلاق مند اور امرا میں ممتاز شمار ہوتے تھے۔ ادبی ذوق بہت بلند اور پاکیزہ تھا۔ ایک بلند مرتبہ باپ کے متذکرہ بالا سارے اوصاف ان کے بیٹے کلیان سنگھ میں موجود تھے۔ وہ باپ ہی کی طرح اخلاق مند، ممتاز الملک، سخن سنج، سخن فہم اور سخنوروں کے قدردان تھے۔ جہاں اشرف علی فغاں ان کے والد کے دربار سے وابستہ تھے وہیں میر ضیاء الدین ضیاؔ کی دربار عاشق سے وابستگی ان کے ادبی ذوق کی دلالت کرتی ہے۔ میر شیر علی افسوس اور میر امن جیسی بڑی شخصیتیں بھی ان کے دربار سے فیض اٹھاتی

رہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے اس سلسلے میں لکھا ہے :

''مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق، باکمال، ہمہ داں، شیریں زباں عاشق مزاج و رنگیں اطوار تھے۔ ہندو مسلمانوں کے مشترکہ تمدن کے بہترین نمائندہ، اپنے والد بزرگوار مہاراجہ شتاب رائے کے مسلک پر کاربند، مخیّر، فیاض اور سرپرست علم وفن'' (۲۹)۔

کلیان سنگھ کے سیاسی زندگی کے واقعات تاریخ مگدھ میں ملتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کلیان سنگھ عاشق اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ اور دونوں زبانوں میں نثر نویسی پر بھی مکمل عبور رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں دواوین کے علاوہ تاریخ سے متعلق کتابیں بھی ملتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ کلیان سنگھ عاشق کو تاریخ نویسی سے بھی دلچسپی تھی۔ تاریخی کتب مسٹر ابراہیم والیڈ کی فرمائش پر لکھی تھیں۔ ان کی کتاب خلاصۃ التواریخ کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے جو نواب سرفراز حسین خاں نے کہا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے باپ مہاراجہ شتاب رائے کی طرح صاحب تدبیر نہ تھے لیکن علمی صلاحیتوں میں اپنی مثال آپ تھے۔ ناز و نعم میں پرورش پانے کے سبب ان کا مزاج عیش پرست ہو گیا تھا۔ ان کی علمی یادگاروں کا ذکر کرتے ہوئے اختر اورینوی نے لکھا ہے :

''کلیان سنگھ عاشق کے فارسی میں بکثرت دواوین، متعدد مثنویاں اور قصائد ہیں مگر اردو میں متفرق اشعار کے علاوہ صرف ایک سہرا اور ایک مثنوی ملتی ہے جس کے بہت سے اشعار ضائع ہو گئے ہیں۔ یہ مثنوی بہ اقساط رسالہ معاصر پٹنہ میں شائع ہوتی رہی ہے اور پھر یکجا بھی 'دائرۂ ادب' پٹنہ کی طرف سے مرتب کر دی گئی ہے جو میرے پیش نظر ہے'' (۳۰)۔

مثنوی کلیان سنگھ عاشق کے نام سے مذکورہ مثنوی کو مطبوعہ رسالہ معاصر

پٹنہ) ڈاکٹر منصور عالم نے ترتیب و تدوین اور مقدمہ کے ساتھ دوبارہ کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ انھوں نے کلیان سنگھ عاشق پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر منصور عالم، کلیان سنگھ کی تصانیف کے قلمی نسخوں کا عکس بھی حاصل کر کے انھیں ترتیب و تدوین کرنے والے تھے۔ راز بلخی نے کلیان سنگھ عاشق کا ایک شعر نقل کیا ہے اور وہی شعر فصیح الدین بلخی نے بھی اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

مچایا ہے جگر نے حشر کا سا شور پہلو میں
مگر دیکھا ہے یہ حالِ دلِ رنجور پہلو میں

اختر اورینوی نے رسالہ معاصر سے کلیان سنگھ عاشق کی مثنوی سے کچھ اشعار نقل کیے ہیں، جنھیں یہاں پیش کیا جا رہا ہے اسے کلیان سنگھ عاشق کی شاعری کا نمونہ سمجھا جا سکتا ہے۔

ہوا تیرے جلوے سے بے خود کلیم ۔۔۔ کیا اس نے اس شعلے سے خوف و بیم
دمِ وصل موسیٰ ہوا بے خبر ۔۔۔ تجلی سے تیری گرا کوہ پر
محمد سزاوارِ دیدار ہے ۔۔۔ کہ تیرا وہ یارِ وفادار ہے

محمد ہے محبوب پروردگار ۔۔۔ محمد ہے مطلوب پروردگار
محمد کی سب سے بڑی شان ہے ۔۔۔ محمد کا چاکر سلیمان ہے

گھٹا گھر کے آئی پڑے ہے پھہار ۔۔۔ چمکتی ہے بجلی بہ شانِ شرار
گرجتا ہے بادل عجب شور سے ۔۔۔ برستا ہے ابر سیہ زور سے
عجب دھوم سے قطرہ زن ہے سحاب ۔۔۔ چھپا ابر تاریک میں آفتاب

قرار بے کا منہ کھول ساقی شتاب ۔۔۔ پیالے میں بھر پرتگالی شراب
کہ کہتا ہوں میں اب کہانی نئی ۔۔۔ دکھاتا ہوں غم کی نشانی نئی

ایک مثنوی کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ ستر برس کے ہو چکے تھے اور اس سن میں آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مثنوی کے اشعار میں بینائی کے حصول کی دعا کی ہے۔

تو اب کر دے روشن مری دونوں عین   طفیل حسنؓ اور طفیلِ حسینؓ
ترے فضل سے اے قدیم المثال   کٹے عیش و عشرت میں ہفتاد سال

کلیان سنگھ عاشق کی مثنوی نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر علی احمد دانش لکھا ہے:

''عاشق کی مثنوی نگاری کی صلاحیت مسلم و مکمل ہے'' (۳۱)۔

کلیان سنگھ عاشق کے حالات زندگی اور کارناموں پر نظر کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک وسیع النظر انسان تھے ان کا اسلام کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ وحدانیت کے قائل تھے۔ رسالت و امامت کے عقیدت مند اور شیدائی تھے۔ قادر الکلام شاعر اور نثر نویس تھے۔ اسلامی تصوف پر بھی ان کی گہری نظر تھی بلکہ اپنی عملی زندگی میں اس پر عمل بھی کیا۔

فراقی عظیم آبادی، کنور پریم کشور

فارسی نثر میں وقائع عالم شاہی کے مصنف ہیں۔ لکھنؤ، بنارس اور کلکتے کا سفر کیا تھا۔ آرام کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ یادگار شعرا کے مطابق اردو اور فارسی میں نظمیں اور کبت اور دوہے بھی کہتے تھے (۳۲)۔

نساخ نے سخن شعرا میں ایک اردو شعر درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''نبیرۂ راجہ جوگل کشور باد فروش ترک علایق کر کے سیاحت کرتے تھے'' (۳۳)۔

فرحتؔ، لالہ رام چند

پٹنہ کے محلہ عالم گنج میں رہتے تھے۔ فارسی کے بڑے پُرگو شاعر تھے۔ فارسی میں دیوان کے علاوہ دو دفتر مثنوی کے لکھے تھے۔ ایک کا نام 'گنج شائگاں' اور دوسرے دفتر کا نام 'گنج بادآورد' ہے۔ حمد ونعت صنعت ذو بحرین میں لکھی ہے (۳۴)۔
یہ مثنوی انھوں نے ۱۱۸۸ھ میں تصنیف کی تھی۔ مثنوی کے متفرق اشعار فصیح الدین بلخی نے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں۔ شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے چار ماہ میں مثنوی مکمل کی تھی۔ اس میں ۹۱۳۲ اشعار ہیں۔

نیز شعر ہر دو دفتر در شمار
یک صد است وسی و دو بانۂ ہزار

گریاںؔ، راجہ بھوانی سنگھ

راجہ بھوانی سنگھ بہادر عرف راجہ کنور والد کا نام راجہ شتاب رائے۔ شاگرد فدوی۔ نمونۂ کلام:

دل ہی نہیں ملے ہے ملے کیا نشانِ داغ
مدت سے ڈھونڈتا ہوں کروں کیا بیان باغ (۳۵)

عشقی نے ان کو کلیان سنگھ عاشق کا بھائی لکھا ہے اور یہ بھی کہ ان کا انتقال کلکتہ میں ہوا (۳۶)۔

لالہ جگر ناتھ سنگھ

لالہ جگر ناتھ سنگھ کے حالات دستیاب نہیں ہوتے البتہ ان کی ایک مثنوی

''ست کنور'' کے بارے میں پروفیسر اختر اورینوی نے تھوڑی سی روشنی ڈالی ہے (۳۷)۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے فارسی مخطوطات کا ایک مجموعہ ملا ہے۔ اس کے آخری حصہ میں اردو کی ایک قلمی مثنوی کے سات اوراق اور کل ۳۵۶ اشعار ہیں۔ آغاز یوں ہوتا ہے:

داستاں بزبان ہندوی آمیز

هو القادر بسم الله الرحمن الرحیم

سنو قصہ محبانِ غم گساران — سونا ہے زبانی بعضے یاران

کہ اس میں ست و دانائی کا ہے بات — وفاداری و رسوائی کا ہے بات

پروفیسر اختر اورینوی مزید لکھتے ہیں:

''مثنوی ست کنور آج سے قریب ڈیڑھ سو سال پہلے کی تصنیف ہے۔ یعنی ۱۲۱۱ فصلی (۱۸۰۴ء)۔ لہٰذا لالہ جگر ناتھ سنگھ اواخر اٹھارھویں صدی اور اوائل انیسوی صدی کے شاعر ہیں۔ غالبًا کاتب بکرماجیت کے ہم ضلع تھے۔ کتابت (ماہ اگست ۱۸۰۸ء مطابق ۱۲۱۵ فصلی تحریریافت) تصنیف کے معاً بعد ہوئی ہے یعنی پانچ سال بعد'' (۳۸)۔

مثنوی کا قصہ یہ ہے۔ ایک راجہ تھا جس کے چار بیٹے تھے۔ سب کے سب نیک اور ہوشیار و سمجھدار تھے۔ اتفاقاً رانی کا انتقال ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد پنڈتوں نے راجہ کو دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیا۔ راجہ کے بیٹوں نے بھی اس خیال کی تائید کی کیوں کہ راجہ بہت اُداس رہتا تھا۔ راجہ کی شادی ہو گئی۔ بیٹوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب جب کہ راجہ کی شادی ہو گئی ہے ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے کیوں کہ راجہ کی جان کو خطرہ بھی ہوسکتا ہے لہٰذا انھوں نے آپس میں طے کیا رات میں باری باری سے ایک ایک پہرہ دے گا۔ جب چھوٹے بیٹے کنور کی باری آئی تو وہ پہرہ دینے لگا۔ رات

میں عفریت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ کنور نے اس سے پوچھا کہ کیوں روتی ہے۔ اس نے کہا کہ راجہ بہت جلد مر جائے گا اس لیے روتی ہوں۔ کنور نے دریافت کیا کہ راجہ کو کس طرح بچایا جا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ راجہ اور رانی سو رہے ہیں اوپر ایک سانپ لٹک رہا ہے وہ گرے گا اور راجہ کو ڈس لے گا۔ اگر کوئی سانپ کو مار دے اور سانپ کے خون کا ایک قطرہ بھی راجہ کے بدن پر نہ گرے تو راجہ بچ جائے گا۔

کنور نے سانپ کو مارنے کا ارادہ کیا۔ وہ راجہ کے محل میں داخل ہوا۔ اس نے سانپ کو مار گرایا مگر اس کے خون کا ایک قطرہ رانی کے سینے پر گر گیا۔

کنور نے سوچا کہ اگر یہ خون راجہ نے چھو لیا تو بھی مر جائے گا۔ اس نے کچھ دیر سوچا۔ پھر اپنی زبان سے وہ خون صاف کر دیا۔ اتنے میں رانی جاگ گئی۔ اس نے سارا قصہ کہہ سنایا مگر رانی کا اصرار تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہم بستری کرے جس کے لیے کنور راضی نہیں ہوا تو رانی نے اسے دھمکی دی کہ اگر تو میری خواہش پوری نہیں کرے گا تو کل تجھے پھانسی دلوا دوں گی۔ لیکن کنور راضی نہ ہوا اور وہاں سے چلا گیا۔ دوسرے دن رانی نے راجہ سے کہہ کر کنور کو پھانسی کی سزا سنا دی۔ اِدھر کنور نے اپنے بھائیوں سے سارا ماجرا کہا۔ دوسرے دن راجہ نے کنور کو پھانسی دیے جانے سے قبل اپنے بیٹوں کو باری باری سے بلا کر اس سلسلے میں بات چیت کی۔ راجہ کے بیٹوں نے راجہ کو ایک ایک کہانی بھی سنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ بھی کرو پوری طرح سے سوچ سمجھ کر کرو۔ آخر میں راجہ نے کنور سے سچ سچ بات سن کر رانی کو زمین میں گڑوا دیا اور راج پاٹ بڑے بیٹے کو سونپ دیا۔

شاعر لالہ جگر ناتھ سنگھ کا بہار کے آرہ ضلع کے موضع مخدوم پور سے تعلق تھا۔ مخطوطہ پر موجد ترقیمہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی کتاب بکرماجیت نے کی جو موضع مخدوم پور پرگنہ آرہ ضلع شاہ آباد کے رہنے والے تھے۔ یہ مثنوی قدامت کے اعتبار سے بہار میں اس صنف سخن کی تاریخ کے مدنظر اہمیت کی حامل ہے۔ البتہ اس کی

زبان ہندی آمیز اردو ہے۔

مجبورؔ، رائے خوشحال سنگھ

ساکن پٹنہ، مہاراجہ شتاب رائے کے فرزند، بقول شورشؔ اچھے شاعر ہیں(۳۹)۔

مسکینؔ، لالہ بخت مل

عظیم آباد میں تھے اور ۱۱۹۰ھ میں حیات سے تھے۔ ان کی شاعری کا نمونہ یہ ہے۔ مضمون آفرینی اور پُرگوئی میں شہرت رکھتے تھے۔

روئے زمیں پہ جتنے بے یاد حق ہیں پھرتے
وہ آدمی نہیں ہیں ماٹی کی مورتی ہیں (۴۰)

بقول صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم: انھوں نے اشعار بہت کہے لیکن تحسین سے محروم رہے۔ مندرجہ بالا شعر بھی اس تذکرے میں ملتا ہے۔ علی ابراہیم خاں نے ان کا نام تخت مل لکھا ہے(۴۱)۔

حواشی

(۱) تاریخ شعرائے بہار، ص۲۔ نشترِ عشق: مرتبہ ومترجمہ عطا کاکوی، ص۲۲۔

(۲) بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا: اختر اورینوی، ۲۲۴-۲۲۶۔

(۳) ایضاً

(۴) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۴-۱۱۔

(۵) یادگار شعرا از اسپرنگر، ترجمہ طفیل احمد، ص ۲۷-۲۸۔

(۶) تاریخ شعرائے بہار، ص ۶۶۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۳۱۔

(۷) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۹۔ یادگارِ شعرا، ص ۳۵-۳۶۔

(۸) تاریخ شعرائے بہار، ص ۶۷۔

(۹) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۳۲ -۳۳۔

(۱۰) تاریخ شعرائے بہار، ص۶۴۔ یادگار شعرا، ص ۳۹۔

(۱۱) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۲۴۔

(۱۲) بزم شمال، ص۷۲-۷۳۔ آئینۂ ترہت، ص ۳۷، ۲۵۶۔

(۱۳) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۵۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۷۔

(۱۴) ہندو شعرا، ص ۵۷۔ تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۰۷۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۲۲۔

(۱۵) بزم شمال، ص ۷۰-۷۲۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۹۔

(۱۶) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۲۳-۲۴۔

(۱۷) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۱۰۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۲۲۔

(۱۸) تاریخ شعرائے بہار، ص۲۲۔

(۱۹) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۸۔

(۲۰) یادگارِ شعرا، ص ۹۷-۹۸۔

(۲۱) یادگارِ شعرا، ص ۱۰۳۔

(۲۲) تاریخ شعرائے بہار، ص ۶۴۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۳۲۔

(۲۳) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۱۹۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۳۱۔

(۲۴) یادگارِ شعرا، ص ۱۱۷۔

(۲۵) مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشقؔ، از ڈاکٹر منصور عالم، ص ۱۷۔

(۲۶) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۲۰-۲۱۔

(۲۷) تاریخ شعرائے بہار، ص ۳۰۔

(۲۸) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۳۴۲، ۳۴۳، ۲۴۳۔

(۲۹) ایضاً (۳۰) ایضاً

(۳۱) بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا، ص ۸۵۔

(۳۲) یادگارِ شعرا، ص ۱۳۲۔

(۳۳) سخن شعرا، ص ۳۶۲۔

(۳۴) تاریخ شعرائے بہار، ص ۵۰۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۲۴-۳۱۔

(۳۵) تاریخ شعرائے بہار، ص ۶۴۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۲۲۔

(۳۶) یادگار شعرا، ص ۱۴۸۔

(۳۷) سراج و منہاج، ص ۱۵۹، ۱۶۶۔

(۳۸) ایضاً (۳۹) یادگارِ شعرا، ص ۱۴۸۔

(۴۰) تاریخ شعرائے بہار، ص ۵۷۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۸۔

(۴۱) یادگار شعرا، ص ۱۵۸۔
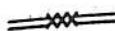
(ب) شعرائے متوسّطین

۱۲۰۱ھ تا ۱۳۰۰ھ

آزاد، رائے بھوانی پرساد (۱)

۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ شادؔ عظیم آبادی کے شاگردوں میں آزاد کا نام بھی شامل ہے۔ یہ محلہ کالی استھان عظیم آباد میں رہتے تھے اور رائے ایسری پرساد عطاؔ کے حقیقی بھتیجا تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ راجہ رام نرائن موزوںؔ عظیم آبادی تھے۔ آزادؔ کا شمار عظیم آباد کے رؤسا میں ہوتا ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اپنے گھر پر مشاعروں کا اہتمام بھی کیا کرتے تھے، جن میں شاد عظیم آبادی کے شاگردوں کی بڑی تعداد ان کی حوصلہ افزائی کے لیے شریک ہوتی تھی۔ ان کا دیوان مرتب تھا جسے قیس رضوی شاگرد عظیم آبادی (مصنف گلشن حیات) نے دیکھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۰ سال تھی اور ان کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا۔

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

جو تیرے ظلم و ستم کا وفور ہو جاتا　　قصوروار ترا بے قصور ہو جاتا
نہ کرتی موج حوادث اگر درانداذی　　تو بحرِ غم سے ہمارا عبور ہو جاتا

نہ اس سرا کا کبھی بند کارخانہ ہوا　　کوئی سحر تو کوئی شام کو روانہ ہوا
ترا جمال دکھانا ہمارا مر جانا　　کچھ ایسی بات نہ تھی جس کا اک فسانہ ہوا
تعلقات نے پاؤوں میں بیڑیاں ڈالیں　　گھر اپنا آپ مرے حق میں قیدخانہ ہوا
ہزار شکر نہ حسرت کا ہم نے منہ دیکھا　　امید وصل کے پہلے ہی دم روانہ ہوا

سنا رہی ہے یہی روح گھُٹ کے اے آزاد
وطن سے آئے ہوئے ہم کو اک زمانہ ہوا

ناراض مجھ سے کیوں بت مغرور ہو گیا　　تجھ سے گناہ کیا دلِ رنجور ہو گیا

آزادؔ شکر ہے کہ بھلے دن اب آ گئے   بد قسمتی کا داغ جو تھا دور ہو گیا(۲)
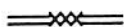
اخترؔ، لالہ درشن لال

منشی پرشن لال پرشنؔ کے بھائی۔ ان کا کلام بھی پرشنؔ کے کلام کے ساتھ شائع ہوا تھا، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی شعر و شاعری میں دلچسپی رکھتے تھے۔ فصیح الدین بلخی نے ان کی غزل نقل کی ہے، جو یہ ہے:

لکھا ہے ایک خط اس نے مجھے شادماں ہو کر
کیا تحریر احوال اس میں اپنا مہرباں ہو کر

یہ ساعت تھی بہت احسن جو قاصد لے کے خط آیا
پڑھا میں نے دل و جاں سے اسے کیا شادماں ہو کر

لگاتے ہی ترے خط کو منور ہو گئیں آنکھیں
سواد خط نے بخشا نور مجھ کو نور جاں ہو کر

میرے گھر میں ہوا مہمان جو وہ غیرت گلشن
کھلا میرا دل پژمردہ مثل بوستاں ہو کر

کیا اخترؔ کو جیسا شاد اے دلبر اسی عنواں
کرو آنکھیں منور عاشقوں کی نور جاں ہو کر(۳)

افسرؔ، راجا ید ما نند سنگھ بہادر

راج بنیلی و کھرک پور ضلع پورنیہ و بھاگل پور کے مالک تھے۔ ۱۸۸۳ء میں

۲۹ سال کی عمر میں اپنے والد مہاراج لیلا نند سنگھ کی جگہ مسند نشیں ہوئے تھے۔ اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور بنگلہ زبانوں میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ خم خانۂ جاوید میں ان کا ذکر ملتا ہے اور نمونۂ کلام بھی۔

دل میں حسرت نہ رہے آج اگر تم چاہو
لب بلب سینہ بہ سینہ ہو بسر آج کی رات

بل بے شوخی کہ مجھے آپ تو بھیجا نہ جواب
خط نہ لکھنے کا گلہ اس پہ ہے الٹا اے شوخ

چاہنے والے کی ہوتی نہیں چاہت برباد
شمع جل کر ہوئی پروانہ کی صورت برباد

قدرداں ہم ہیں آکے سنگھا و صاحب
مفت کیوں کرتے ہو تم زلف کی نکہت برباد

جو آرزوئیں دل میں تھیں سب خاک ہوئیں
تیغ اجل نے کاٹ دیے دست و پائے حرص (۴)
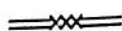
الفتؔ، لالہ انت رام

اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ کے یہاں جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں شرکت کرتے تھے۔ خم خانہ جاوید کے مطابق ۱۸۷۸ء تک حیات سے تھے۔ رحمتیؔ کے مشاعروں کے گل دستے مطبوعہ ۱۲۹۵ھ میں بھی ان کا کلام شامل ہے۔ وہیں سے فصیح الدین بلخی نے اپنے تذکرے میں ان کا کلام نقل کیا

ہے۔ ایک شعر تاریخ شعرائے بہار میں اور دو اشعار ہندو شعرا میں ملتے ہیں جب کہ فصیح الدین بلخی نے الفت کا زیادہ سے زیادہ کلام گلدستہ تحفۂ رحمتی سے نقل کیا ہے۔

رباعیات

گزرے ایام جوانی افسوس وہ رنگ شباب ارغوانی افسوس
پیری آئی کہ کوئی قاصد آیا لایا ہے جواب زندگانی افسوس

وہ عیش وہ ساز اے جوانی افسوس وہ وصل کی شب وہ شادمانی افسوس
کیا حال کہوں جو تیری صحبت چھوٹی تنہائی کو دو بے زبانی افسوس

غزل

دیکھی تری انجمن ہمیشہ تھا پیش نظر چمن ہمیشہ
زخموں سے ہے زیب تن ہمیشہ گلنار ہے پیرہن ہمیشہ
ممکن نہیں وصل ہو میسر اغیار ہیں رخنہ زن ہمیشہ
تھا دل کو لگاؤ ابروؤں سے دیکھا کیے بانکپن ہمیشہ
کرتا رہا ہم سے آسماں چال کج اس کا رہا چلن ہمیشہ
ناقوس عبث بتوں کے آگے پھونکا کیے برہمن ہمیشہ
اثبات دہن میں گفتگو کیا غیروں سے جو ہو سخن ہمیشہ
جاتا نہیں میکشی کا لپکا مستانہ رہا چلن ہمیشہ
کیا تیغ ہے باڑھ پر تمھاری جوہر سے ہے موجزن ہمیشہ
نرگس کی نظر کہیں نہ لگ جائے جایا نہ کرو چمن ہمیشہ
اللہ رے اشک کی روانی چشمے ہیں یہ موجزن ہمیشہ
چوٹی کا بندھا نہ ہم سے مضموں الجھا ہی رہا سخن ہمیشہ
ساقی سے ہے دار بست ہم کو میخانہ رہا وطن ہمیشہ

مژگاں کی خلش گئی نہ دل سے پہلو میں ہے نیش زن ہمیشہ
کوچہ ہے بتوں کا دل سے ہشیار ہیں گھات میں راہزن ہمیشہ
کس بت نے سنی صدائے تکبیر زاہد رہے نعرہ زن ہمیشہ
غربت میں بھی ہم تھے فارغ البال تھا پیش نظر وطن ہمیشہ
کیوں کر نہ ہو عشق دشمنِ جاں ہے باعث صد محن ہمیشہ
ہم مست ہیں پھول لے رہے ہیں ہے مدّ نظر چمن ہمیشہ
تھی دل کو جو کمر کی الفت بڑھتا رہا ضعف تن ہمیشہ
داغوں سے ہوا یہ لطف حاصل پہلو میں رہا چمن ہمیشہ
مرتے رہے جیتے جی بھی تم پر تھا جامہ تن کفن ہمیشہ
گیسو کا ہے تیرے گرم بازار سودا کا رہا چلن ہمیشہ
عقدہ یہ کھلا ترے دہن کا سر بستہ رہا سخن ہمیشہ
کیا زور ہے اضطراب دل کا اک برق ہے شعلہ زن ہمیشہ
ہے دل میں ہجوم درد وغم کا دن رات ہے انجمن ہمیشہ
ساقی وہ مئے دو آتشہ دے جو دل میں ہو شعلہ زن ہمیشہ

وصف رُخ گل رخاں سے الفتؔ
رنگیں ہے مرا سخن ہمیشہ (۵)

مندرجہ بالا ۲۸ اشعار کی غزل کے سرسری مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ الفتؔ نے نہایت روانی سے طول طویل غزلیں کہی ہیں۔ اس سے ان کی قادر الکلامی بھی ثابت ہوتی ہے۔ موضوع وہی روایتی شاعری جیسا ہے یعنی حسن وعشق اور غم روزگار کا بیان۔ فصیح الدین بلخی نے الفتؔ کا فارسی کلام بھی درج کیا ہے۔
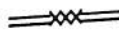
اُلفتی عظیم آبادی، راجہ پیارے لال

عزیز الدین بلخی رازؔ عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''الفتی، راجہ پیارے لال ولد رائے سکھن جی قوم کائستھ ماتھر۔ متوطن سکندرہ متصل اکبرآباد، فارسی انشا پردازی میں مشہور تھے۔ ایک مدت تک دلّی میں اکبر شاہ ثانی کے میر منشی رہے۔ بالآخر ترکِ روزگار کر کے عظیم آباد چلے آئے۔ ۱۲۵۴ فصلی میں فوت ہوئے۔ ان کے خانگی کتابخانے میں کئی ہزار کتابیں تھیں۔ علاوہ مثنوی 'نیرنگ تقدیر' و 'مینا بازار' فارسی میں دیوان مرتب ہے''۔

نمونۂ کلام کے طور پر رازؔ عظیم آبادی نے الفتی کا ایک اردو شعر درج کیا ہے:

خاکساری سے مثالِ نقشِ کفِ پا
جس جگہ بیٹھے وہیں کے ہو گئے (۶)

یہی شعر تذکرہ ہندو شعرا میں خواجہ عشرتؔ لکھنوی نے بھی درج کیا ہے۔ خواجہ عشرتؔ لکھنوی نے ان کا نام ''راجہ الفت رائے دہلوی'' لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ''ترک روزگار کر کے عظیم آباد چلے گئے اور وہیں انتقال کیا'' (۷)۔ ان کا سال وفات ۱۲۵۰ھ ہے۔ فارسی دیوان ان کے پوتے رحمتی نے ۱۸۷۰ء میں چھپوایا تھا۔

بدرؔ، راجہ گنگا پرساد

عظیم آباد کے رؤسا میں تھے۔ گل محمد خاں ناطقؔ مکرانی سے شرف تلمذ تھا۔ رازؔ بلخی عظیم آبادی نے فارسی کا ایک شعر نقل کیا ہے (۸)۔ رحمتی کے مشاعرے کے گلدستے میں ان کی دو غزلیں ملتی ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی رحمتی کے مشاعروں

میں شرکت کرتے تھے۔ البتہ یہ غزلیں فارسی کی ہیں۔
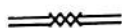
بسمل، منشی منولعل

عظیم آباد میں رہتے تھے اور قوم کے کائستھ تھے۔ ان کا ایک شعر تاریخ شعرائے بہار میں ملتا ہے، جو یہ ہے:

دیکھا کبھی نہ بھر نظر اس خوف سے انھیں
دھبّہ لگے نہ گورے بدن پر نگاہ کا (۹)

۱۲۹۸ھ کے بعد وفات ہوئی۔ انجمن تحفۂ رحمتی کے گلدستے میں ان کی تین غزلیں شامل ہیں، جنھیں فصیح الدین بلخی نے اپنے تذکرے میں نقل کیا ہے:

سنتے تو رہے سخن ہمیشہ ‏ آیا نہ نظر دہن ہمیشہ
یوسف نہ ملا تو پیر کنعاں ‏ سونگھا کیے پیرہن ہمیشہ
وہ چشم سیہ جو تھی نظر میں ‏ دیکھے کالے ہرن ہمیشہ
بلبل کی دعا یہی ہے ‏ شاداب رہے چمن ہمیشہ
پروانہ صفت کسی کی لو میں ‏ جلتا ہی رہا بدن ہمیشہ
بلبل جو کرے ثنا کسی کی ‏ گلریز رہے دہن ہمیشہ
پروانوں کے داغ دل سے ہر شب ‏ روشن رہے انجمن ہمیشہ
مہتاب سے مہر سے زیادہ ‏ چمکا کیا وہ بدن ہمیشہ
ہاتھوں سے جنوں کے قبر میں بھی ‏ صد چاک رہے کفن ہمیشہ
برآئے امید وصل کیوں کر ‏ افلاک ہیں رخنہ زن ہمیشہ
اے چرخ یہ کیسی کج روی ہے ‏ اک جا نہ رہیں دو تن ہمیشہ
اس تیغ دو دم کی آرزو میں ‏ پہنے ہی رہے کفن ہمیشہ

حالت پہ ہماری بے خودی کی رہتے ہیں وہ خندہ زن ہمیشہ
دلچسپ ہے گو متا غربت پر یاد رہا وطن ہمیشہ
کسی ترچھی نگاہ کا ہوں بسمل
بھایا کیا بانکپن ہمیشہ

═══

بہارؔ، منشی اجودھیا پرساد

بابو گوپال لال داروغہ کے فرزند، قوم کائستھ، متوطن منیر شریف۔ ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں کچھ دنوں مظفر پور میں رہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد مہاراجہ دربھنگہ کے یہاں ملازمت سے وابستہ ہوئے اور اس شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی اچھی صلاحیت تھی۔
فن شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھیں صحافت سے بھی لگاؤ تھا۔ مظفر پور سے ۱۸۶۸ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار 'اخبار الاخیار' کی اشاعت عمل میں آئی تو اجودھیا پرساد نے اس کی ادارت سنبھالی۔ ریاض ترہت (۱۸۶۸ء) کے نام سے انھوں نے ترہت کی تاریخ لکھی جو مطبوعہ ہے۔ ان کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ دو تین غزلیں اور کچھ متفرق اشعار ریاض ترہت میں موجود ہیں (۱۰)۔

═══

بیتابؔ، لالہ کشن نرائن

بھاگل پور میں سکونت رکھتے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں وفات پائی۔ ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

ہوائے شوق گلستاں میں ہوں میں سرگرداں
پھرے گا ساتھ میرے تو کہاں کہاں صیاد

ترے کوچے کے لاکھوں راستے ہیں
بھلا کیوں کر نہ دھوکا کھائے عاشق (۱۱)
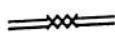
بیدلؔ مظفرپوری، بابو اودھ بہاری سنگھ

موجودہ ضلع سیتا مڑھی کے موضع بترہ کے ایک برہمن خانوادے میں ۱۲۷۲ھ/۱۸۶۶ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔ ابتدا میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۲ء میں انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد پٹنہ کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور لنگٹ سنگھ کالج مظفرپور کے قائم ہوتے ہی وہاں شعبۂ عربی و فارسی کے پہلے استاد مقرر کیے گئے۔

بیدلؔ صوفی منش تھے۔ حضرت جھاو شاہ سے بیعت حاصل کی تھی وہ توکل قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ لہٰذا سنجر نامی شاعر سے مشورۂ سخن کیا۔ سنجر تہرانی نام کے ایرانی شاعر ہندستان میں تھے۔ ممکن ہے یہ وہی سنجر ہوں۔ کیوں کہ بیدلؔ فارسی کے بھی بہت بڑے شاعر تھے۔ سنجر تہرانی (وفات ۱۹۱۱ء) کا نام میرزا عبدالعطوف محمد تقی کمال الدین تھا جو آغا سنجر کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ ۱۹ویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں تھے۔ رامپور میں وفات پائی۔ یہ بڑے پُرگو شاعر تھے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے مقالہ ڈاکٹر سید حسن عباس بہ عنوان ''احوال و آثار سنجر تہرانی'' مطبوعہ خدا بخش لائبریری جرنل، شمارہ ۱۴۱، ص ۸۵-۱۰۴، جولائی-ستمبر ۲۰۰۵ء)۔

بیدل کا نمونۂ کلام یہ ہے:

بیدؔل ہے میرا مولا بن مانگے دینے والا
جو ہیں کریم خود وہ سائل کو ڈھونڈتے ہیں

اگر اپنے دل پہ ظالم ہمیں اختیار ہوتا
نہ یہ جاں کنی ہی ہوتی نہ یہ انتظار ہوتا

ترا حسن اس جہاں میں جو نہ ہوتا پرتو افگن
نہ یہ پھول دل لبھاتے نہ یہ سبزہ زار ہوتا

نہ یہ رٹ لگاتی کوئل نہ پپیہا شور کرتا
نہ وہ ماری ماری پھرتی نہ وہ بے قرار ہوتا

نہ یہ آبشار ہوتا نہ یہ برف مسکراتی
نہ یہ پتھر آہ کرتے نہ کہیں شرار ہوتا

نہ ہمالہ اپنے سر کو سوئے آسماں اٹھاتا
نہ تری جھلک کا یا رب اسے انتظار ہوتا

نہ کلیجہ اس کا پھٹتا نہ یہ گنگا ہی نکلتی
نہ وہ کھل کے دل سے روتا نہ یہ لالہ زار ہوتا

کوئی ایسی جا پہ رہتے کوئی بن ہو یا کہ پربت
تو ہی چارہ ساز ہوتا تو ہی غمگسار ہوتا

جو قضا گلے سے ملتی تو لپٹ کے اس سے سوتے
نہ کوئی اٹھاتا لاشہ نہ کہیں مزار ہوتا

ہے یہ آرزوئے بیدلؔ کہ وہ کاش خاک ہوتا
تو غبار بن کے دامن پہ ترے نثار ہوتا(۱۲)

═══
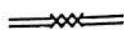
پانڈےؔ، موہن لال

خسروپور (پٹنہ) کے قریب موضع بیکنٹھ پور کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں وفات پائی۔ گورنر جنرل ہسٹنگس کے منشی تھے۔ پورنیہ میں قانون پیشہ کی حیثیت سے کافی دنوں تک کام کیا۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۸۰۴ء صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ لارڈ ہسٹنگس ۱۸۱۳ء میں گورنر جنرل ہو کر آئے اور پانچ برس سے کچھ زیادہ یہاں رہے۔ اس وقت پانڈے موہن لال کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوگی اور اس عمر میں گورنر جنرل کا منشی مقرر ہونا صحیح نہیں ہوسکتا(۱۳)۔ اس لحاظ سے فصیح الدین بلخی کا خیال درست ہے۔ ان کے اردو کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہوا۔

═══
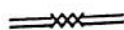
پرشنؔ، منشی پرشن لال

موضع پچونا پرگنہ نرہٹ ضلع گیا کے رہنے والے ۱۸۸۴ء کے قریب شاعری کرتے تھے۔ گلدستۂ بہار میں ان کا کلام بھی ملتا ہے، جسے عطاؔ بہاری اور عاصیؔ نے ترتیب دیا تھا۔ یہ گلدستہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

چلو اب بہر استقبال اس بت کے تم اے پرشنؔ
سنا ہے وہ چلا آتا ہے میرا میہماں ہو کر (۱۴)

═══
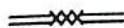
تائبؔ دربھنگوی، بھگوان دین

منشی منگل سین کے بیٹے تھے اور اررریہ ضلع پورنیہ میں رہتے تھے۔ قوم کے کائستھ تھے۔ منشی شنکر دیال صباؔ ندروی کے شاگرد تھے۔ ۱۲۷۱ھ میں ۵۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

باغ دنیا میں وہ شجر ہیں ہم　　پھولتے ہیں کبھی نہ پھلتے ہیں
ڈھونڈتا ہوں انھیں جو اے تائبؔ　　خانۂ دل میں وہ نکلتے ہیں (۱۵)

تذکرۂ خم خانۂ جاوید میں دو غزلیں ملتی ہیں۔

ثاقبؔ عظیم آبادی، راجہ جے گوپال سنگھ بہادر

عظیم آباد کے رئیس تھے۔ ان کا فارسی کا ایک شعر رازؔ بلخی عظیم آبادی نے درج کیا ہے (۱۶):

لذت وصف دہانش بزبانم دادند
آبِ حیواں بہ دہانم ز بیانم دادند

جابرؔ، بابو جگل کشور

منشی مادھو حزںؔ کے بیٹے، قوم کائستھ، محلّہ رمنہ گیا میں رہتے تھے اور وکیل تھے۔ شعر و شاعری میں حشرؔ بیتھوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۱۰ء میں چالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ ایک دو شعر ملتا ہے:

لڑا دینا آپس میں ہے کارِ دنیا
جو سر ہے کسی کا تو پتھر کسی کا

نہیں پرہیز لازم خاک سے انسان کو ہرگز
کہ آخر مٹی میں ملنا ہے اس کو جو بنا گل سے (۱۷)

فصیح الدین بلخی نے لکھا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں وفات ہوئی۔
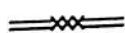
جمیلؔ، لالہ امر چند

آرہ میں مقیم اور صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے۔ فن تاریخ گوئی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

خود منایا مجھے اس بت نے بگڑ کر سر بزم
آج ہے میرے سر آنکھوں پہ ندامت میری

میر فرزند احمد عالی ہمم یعنی صفیرؔ
ہیں وہی راس الرئیس و مرجع برنا و پیر

سال تاریخ ان کے دیواں کا جمیلؔ خوشنوا
از سر زور طبیعت لکھ 'کلام بے نظیر' (۱۸)
۱۲۸۰ھ/۱۸۶۵ء
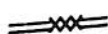
جنگ بہادر

رائے کالکا سہائے کے بیٹے، موضع بھکرا ضلع مظفر پور کے رئیس، نام اور تخلص

ایک ہی ہے یعنی جنگ بہادر۔ تاریخ ولادت تقریباً ۱۸۳۲ء۔ اردو، فارسی اور عربی کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ جنگ بہادر ایک ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے اور انگریزی عہد میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ان کی تصانیف اور کلام نایاب ہیں۔ ایک قصیدہ گورنر جنرل کی مدح میں ۱۸٦۵ء میں، مظفر پور کی نمائش کے موقع پر کہا تھا، ملتا ہے۔ علاوہ ازیں ''سرور المحزونین'' کے نام سے عربی میں ایک رسالہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے، جو ۱۲۸۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے ان کی عربی دانی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قصیدہ ۵۹ اشعار پر مشتمل ہے، یہاں کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

پیدا کیا جو داور دوّار نے جہاں
کتم عدم سے جلوۂ خلقت کیا عیاں

علم و ہنر سخاوت و اقبال و مردمی
بخشا خدا نے عالم انساں کو بے گماں

پر وضع ہر کسی کی نہیں یک نمط پہ ہے
بیشک کمی و بیشی ہے ہر فرد میں عیاں

جس پر کہ لطف حضرت پروردگار ہے
عنصر میں اس کے پانچوں مرکب ہیں بے گماں

شام و عراق و روم و خراسان ملک چین
تاتار اور ختن و خطا اور سیستاں

تا وسع ڈھونڈا عقل نے عنقا سے علم کو
پایا نہ غیر خطۂ یورپ میں کچھ نشاں

لاریب وہ زمین ہے گنجینۂ علوم
ہر علم و ہر ہنر میں سبقت سبھوں کو واں

مینو سواد اس کو جو کہیے تو ہے بجا

یا غیرتِ ارم کہوں یا روکش جناں

شہراس کے ہیں نفیس کہ رضواں بھی دیکھ کر

قطرات سلسبیل میں خجلت سے ہو نہاں

شادابی اور شگفتگی نزہت فزا یہ ہے

جس کی نسیم سے ہے معطر مشام جاں

جنت کا کیوں گماں نہ ہو آثار خلد کے

ظاہر تو ہے بدیدۂ انصاف ہم گناں

نہریں ہیں سلسبیل و مکانات قصر خلد

دوشیزگان حور ہیں غلمان کودکاں

اشجار واں کے ہمسر طوبیٰ ہیں لطف میں

سرسبزی واں کی سبزۂ رخسارِ دلبراں

ہے خاک ایسی مشک جسے دیکھ ہو سیاہ

ہو زرد رو مقابلہ میں جس کے زعفراں (۱۹)

اس قصیدہ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جنگ بہادر نے فن قصیدہ گوئی کے تمام لوازمات کو بخوبی برتا ہے۔ کاش ان کا کچھ اور کلام دستیاب ہوتا تو صوبۂ بہار کی اردو شاعری میں ان کا مقام بخوبی متعین کیا جاسکتا تھا۔
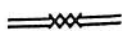
جوہر آروی

جے نند کشور جوہر آروی ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام بابو نند کشور لال۔ جین مذہب کے پیرو اور آرا کے مہاجن ٹولی محلہ میں رہتے تھے۔ شاعری کا شوق تھا۔ ابوالفضل آروی (حشر آروی) کے شاگرد تھے۔ اردو اور ہندی میں لکھتے تھے۔ کئی

ڈرامے میں بھی لکھے۔ اردو ادب کی تاریخ بھی لکھی اور ہندی میں ناول بھی لکھے۔ 'انتخاب کلام جوہرؔ' کے نام سے ایک مجموعہ ۱۹۶۸ء میں دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا تھا۔ ۲رمئی ۱۹۰۹ء کو انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

حرماں ہے غم ہے یاس ہے رنج و ملال ہے
آفت ہے عشق دل کا لگانا زوال ہے

ہم پاکباز رندوں کی دنیا ہی اور ہے
مئے ہی حرام ٹھہری تو پھر کیا حلال ہے

سب جانتے ہیں جی کی مرے تم ذرا ذرا
ہر بار پوچھتے ہو عبث کیا سوال ہے

حاضر ہے دل اسے کوئی لے جائے بھی کہیں
پوچھے گا کون اس کو یہ مفلس کا مال ہے

نالوں سے آسماں کے اڑا دوں ابھی دھوئیں
بدنام کون ہوگا مجھے یہ خیال ہے

وحشت دکھا رہی ہے مجھے رنگ بے طرح
کچھ اور ہی جنون مجھے اب کے سال ہے

ہم سے بگاڑ ہے تو کچھ اس کا گلہ نہیں
غیروں سے کچھ لگاؤ ہے اس کا خیال ہے

جوہرؔ مجھے تو عشق نے مجبور کر دیا
باتیں بھی اب تو ضعف سے کرنا محال ہے (۲۰)
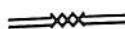
حامدؔ، گھمنڈی لال

مونگیر کے رہنے والے تھے اور حافظ ضیغم کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

نامۂ شوق رقم کرتا ہوں اس کو حامدؔ
کیوں نہ دردِ دل مشتاق کبوتر بن جائے (۲۱)

═══
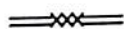
حسرتؔ دربھنگوی، منشی بھوانی پرساد

شاداں فاروقی لکھتے ہیں:

''دربھنگہ کے ممتاز کائستھ گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ سال ولادت نہیں معلوم لیکن ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء تک زندہ تھے۔ زیادہ حال معلوم نہیں۔

منشی جی فارسی و اردو اچھی جانتے تھے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ مولوی مرشد حسن کامل دھرم پوری کی محبت میں جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے، ان میں ان کی بھی شرکت ہوا کرتی تھی۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں اشعار کہا کرتے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں کورٹ انسپکٹر تھے۔

حسرت کا کلام محفوظ نہیں۔ اردو کا صرف ایک شعر ملتا ہے جو انھوں نے منشی اجودھیا پرساد بہارؔ کو خط لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا:

سحر سے دو پہر شب تک ذرا فرصت نہیں ملتی
رہا ہوں جب کورٹ میں حواس اپنا ہے چکر میں'' (۲۲)

═══
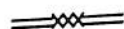
حسرتؔی لالہ بندا پرساد

لالہ مہاراج سنگھ وکیل عدالت دیوانی۔ عظیم آباد کے باشندے تھے۔ فن شاعری میں وزیر علی عبرتؔی عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کا فارسی کا ایک شعر عزیز الدین بلخی رازؔ عظیم آبادی نے اپنے تذکرے میں درج کیا ہے (۲۳)۔

═══ ✕✕ ═══
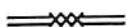
حسیؔن مظفر پوری، منشی ہر چرن سنگھ

والد کا نام منشی چیت نرائن سنگھ، وطن موضع، پدموں ضلع مظفر پور۔ آدمی خلیق، منکسر المزاج تھے۔ کچھ دنوں سیشن جج پٹنہ میں پیش کار رہے، پھر محکمہ فوجداری میں سرشتہ دار ہوئے۔ اس کے بعد ضلع سارن میں ملازم رہے۔ آخر میں ہزاری باغ میں اکسٹرا منصف رہے۔ آئینۂ ترہت کی تالیف کے وقت حیات سے تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے مگر کلام ضائع ہو گیا (۲۴)۔

═══ ✕✕ ═══
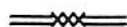
حشمتؔی، لالہ ماتا دین

عظیم آباد کے مشاہیر شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ کچھ دنوں تک مظفر پور میں منصفی کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۸۸۹ء میں گیا میں صدر اعلیٰ تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ میر وزیر علی عبرتی عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ خان بہادر سید خیرات احمد محبؔ پالوی سے خاصا دوستانہ مراسم تھے۔ حشمتؔی کی کوششوں سے میر ہاسی وحیؔد لکھنوی ۱۸۸۱ء میں گیا تشریف لائے تھے اور پھر ان کے آنے کا یہ سلسلہ سال بہ سال جاری حشمتی کو ائمہ اطہار علیہم السلام سے بھی گہری عقیدت تھی۔

چنانچہ خمسۂ کاملہ مصنفہ خیرات احمد محبؔ میں حشمتیؔ کی یہ رباعی درج ہے:

خوشا وہ لوگ جو آئے ہیں بزم ماتم میں
خوشا وہ ہاتھ جو پیٹے حسین کے غم میں

وہ دل ہو خاک نہ ہو جس میں اہل بیت کا غم
وہ آنکھ پھوٹے جو روئی نہ ہو محرم میں (۲۵)

تذکرہ سخن شعرا مؤلفہ نساخ میں بھی ان کا ذکر اور یہ شعر ملتا ہے۔ یہی شعر تاریخ شعرائے بہار (ص ۱۰۳) میں ملتا ہے۔

دیکھیں گے حسن حور تو پھسلے گا دل ضرور
جنت میں بھی یقیں ہے نہ آرام پائے دل

فصیح الدین بلخی نے رائے بیج ناتھ غنیمتؔ کے مشاعروں کی بیاض ۱۲۷۱ھ سے ان کی غزلیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں جن میں سے کچھ اشعار بطور نمونۂ کلام پیش کیے جا رہے ہیں:

ہم بغل آکر جو وہ خورشید پیکر ہو گیا
داغ تھا جو اپنے سینے میں وہ اختر ہو گیا

کیا قیامت ہے دوپٹہ زعفرانی آپ کا
جس نے دیکھا آپ کو جامے سے باہر ہو گیا

جتنا روتا ہوں ہری ہوتی ہے اس سے کشت غم
دامن ابر بہاری دیدۂ تر ہو گیا

اس نے واں آنکھیں لڑائیں چوٹ یاں دل پر پڑی
غیر کی آنکھوں کا ڈھیلا مجھ کو پتھر ہو گیا

ایک گل جب بار دوش باد صرصر ہو گیا

بلبلوں کے ہوش اُڑنے کے لیے پر ہو گیا

تیرے دیوانے میں نازک گل سے بھی اے نازنیں
موج بوئے گل کا جھونکا مجھ کو پتھر ہو گیا

تو نہیں آتا کسی صورت سے یہ ٹلتا نہیں
کیا غمِ ہجراں مجھے چھاتی کا پتھر ہو گیا

اُڑتی پڑتی یہ خبر پیکِ صبا نے دی مجھے
خط کے ٹکڑے اُڑ گئے پُرزے کبوتر ہو گیا

زندگی کا لطف مجھ کو جان دینے میں ملا
آبِ حیواں مجھ کو قاتل آبِ خنجر ہو گیا

یاد میں اک بادہ کش کی دل فنا ہونے لگا
دورِ جام مئے مری نظروں میں خنجر ہو گیا

سخت جانی نے مری اس کو پشیماں کر دیا
ہاتھ میں قاتل کے پانی پانی خنجر ہو گیا

بزم میں دیکھا جو مجھ کو اس نے آنکھیں پھیر لیں
ہائے کیا برگشتہ آج اپنا مقدر ہو گیا

آگ پانی میں لگاتا ہے ہمارا سوزِ دل
اشک کا قطرہ جو نکلا صاف اخگر ہو گیا

حسرتیں جو دل کی تھیں سب اپنے دل میں رہ گئیں
وہ نہ آئے اور مرا وعدہ برابر ہو گیا

تیغ قاتل کی بدولت اپنا پردہ رہ گیا
زخم دامن دار بڑھتے بڑھتے چادر ہو گیا

خلق کے طعنے سنے رُسوا ہوئے در در پھرے

جو نہ ہونا تھا وہ سب اے بندہ پرور ہو گیا
دشت میں مجھ ناتواں کو خوب سرگرداں کیا
دورِ جام مئے ایاغ سر کو چکر ہو گیا
سینہ تو مدت سے ہے ماتم سرا اے حشمتیؔ
ایک دل باقی تھا وہ بھی درد کا گھر ہو گیا
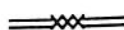
حیرتؔ گیاوی، بابو جگیشر لال

ان کا شمار گیا کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ گیا لٹریری کلب کے خاص اراکین میں تھے اور کلب کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ امداد امام اثرؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ ۱۸۹۸ء کے گلدستہ میں ان کی ایک غزل ملتی ہے۔ یہ گلدستہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے:

یارب کہیں وہ تن سے مرا سر جدا کرے
کب تک یہ بار دوش پہ مرے رہا کرے
چاہے جفا کرے وہ حسیں یا وفا کرے
اب تو دیا دل اس کو جو چاہے خدا کرے
کب تک کوئی فراق کے صدمے سہا کرے
گھبرا کے مر نہ جائے جو انساں تو کیا کرے
موجود ہیں ہدف کو دل و دیدہ و جگر
تیر نگاہ یار جہاں چاہے جا کرے
وہ شمع رو بھی بزم میں ہے اور شمع بھی
پروانہ دیکھیں جان کو کس پر فدا کرے

ہر سبزہ کی زبان سے ہے حمد کبریا
غافل چمن میں گوش نصیحت جو وا کرے

آبِ بقا ہوا نہ سکندر کو دستیاب
تقدیر ہی رَسا نہیں تدبیر کیا کرے

رخصت گلوں سے ہوتے کہ جاتی ہے فصل گل
صیاد بے وفا جو قفس سے رہا کرے

اس وقت اپنے چاہنے والے کی قدر ہو
تم کو بھی جب کسی کا خدا مبتلا کرے

بندہ کو عذر کیا ہے جو مالک کی ہو رضا
راضی ہیں ہم اسی میں جو چاہے خدا کرے

برگشتگیٔ بخت کے شکوے کہاں تلک
تقدیر ہے بگاڑ پہ تدبیر کیا کرے

حیرتؔ خدا گواہ ہے اُف بھی جو لب تک آئے
جو ظلم چاہے وہ بت نا آشنا کرے (۲۶)
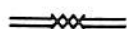
خبرؔ، بابو بلدیو پرساد

آرہ کے باشندے اگروال خاندان سے تعلق تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ تاریخ گوئی کے فن سے بھی دلچسپی تھی۔ صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

جہاں اسیر ہے ہندوئے زلف کی لٹکا

کہاں سے سیکھا ہے ان جوگیوں نے (یہ) ٹوٹکا
بناؤ میں ترا بے ساختہ پن آفت ہے
سلیقہ خاک نہیں حور کو سجاوٹ کا
وہ مہ ہے وعدہ فراموش دیکھیے کیا ہو
ارادہ شام سے ہے سیج کی سجاوٹ کا (۲۷)

خفیؔ عظیم آبادی، راجہ بالو

نمونۂ کلام یہ ہے:

دیکھ سنبل کو چمن میں یاد آئے اُس کے بال
حاصل اس گل گشت سے آخر پریشانی ہوئی (۲۸)

ہے خنک از بس ہوائے گرم ساقی جلد آ
گرم صحبت ہو گی زیب انجمن ہو جائے گا
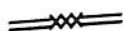
دماغؔ، منشی گنگا لال

والد کا نام منشی کنھیّا لال۔ میران پور 'ندرہ' گیا کے رہنے والے تھے۔ صاحب دیوان تھے مگر دیوان شائع نہ ہو سکا۔ ۱۲۶۸ھ میں ستّر سال کی عمر میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام یہ ہے (۳۰):

ایک ہی شکل کو دو کر کے دکھا دیتی ہے
جوہر آئینہ قاتل تری تلوار میں ہے (۳۰)

گلشن حسن پر بہار نہیں　　کنگھی چوٹی نہیں سنگار نہیں
قتل کو بس ہے خنجر ابرو　　حاجت تیغ آبدار نہیں
باغ عالم میں گل کھلا ہے کچھ　　اے جنوں موسم بہار نہیں

تیری زلفوں سے اماں ہے کسی یار آج کی رات
انھیں دو گالوں نے رکھا ہمیں مار آج کی رات

صاف ہو وصل میں عاشق سے کدورت کیسی
میری جاں دور کرو دل سے غبار آج کی رات

دھرم، منشی دھرم لال

داناپور پٹنہ میں سکونت رکھتے تھے اور ۱۸۸۴ء کے آس پاس مشق سخن کرتے تھے۔ ان کی ایک غزل گلدستۂ بہار سے فصیح الدین بلخی نے نقل کی ہے، جو یہ ہے:

چلا چل کوچۂ جاناں میں اے دل شادماں ہو کر
کبھی آجائے گا وہ بھی ترے گھر میہماں ہو کر

تم اپنے کشتہ کو صاحب ذرا آکر جلاؤ تو
کہاں تم بھاگے پھرتے ہو مسیحائے زماں ہو کر

نہ تم سا خوبرو میں نے پایا زمانہ میں
بہت دیکھا زمانے کو پھر اے اصفہاں ہو کر

تمھارے حسن نور افزا نے کیں آنکھیں مری روشن
کہاں جاؤ گے اے پیارے ان آنکھوں سے نہاں ہو کر

گلستانِ جہاں میں بو جب الفت کی نہیں پاتی
رہے یہ بلبل نالاں بتاؤ اب کہاں ہو کر

پتاں ہو صورت بسمل خدا کے واسطے قاتل
لگا وہ خنجر برّاں کہ نکلے استخواں ہو کر

گل وبلبل کے نظارہ سے کب وہ شاد ہوتے ہیں
گئے جو باغ جنت میں ہیں اس کے بوستاں ہو کر

مجھے دست حنائی یار کا جب یاد آتا ہے
تو اک مدت رہا کرتی ہیں آنکھیں خوں فشاں ہو کر

دھرم کی آرزو یہ ہے کہ تیرے باغ سے اے گل
نہ نکلوں صورت بلبل رہوں میں باغباں ہو کر (۳۱)
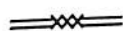
رام پرساد لال

ولد منشی لال بہادر لال مختار عام مہاراجا بنارس۔ ۱۸۹۹ء میں ہرکھو ضلع جونپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم پٹنہ یونیورسٹی میں حاصل کی اور ۱۵/ جولائی ۱۹۴۲ء کو جین کالج آرا میں اردو و فارسی کے لکچرر ہوئے۔ ۳۱/ جون ۱۹۴۶ء کو سبکدوش ہو کر پٹنہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

نہ پوچھو اس کو سنبل سے نہ پوچھو اس کو ریحاں سے
مری حالت ہے ظاہر میرے ہی حالِ پریشاں سے

نکلتی ہے یہی آواز ہر تارِ رگِ گل سے
کہ رخصت ہو رہی ہے فصلِ گل اب اس گلستاں سے

نہ ہم کچھ کر سکے خدمت ہماری رہ گئی حسرت
جو بس چلتا کہیں اپنا نہ چھٹتا ہاتھ داماں سے (۳۲)

رحمتیؔ، کنور سکھراج بہادر

ہیرا لال ضمیرؔ کے فرزند۔ عظیم آباد کی سرزمین میں کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ کی کوششوں سے مشاعروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس کی، مشاعروں کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء کی ہیجان انگیز اور پُر انتشار صورت حال کے سبب ایک طرح سے منجمد سا ہو گیا تھا۔ رحمتیؔ علم دوست اور شاعر و ادیب تھے۔ انھیں شاعری کا ذوق وراثت میں ملا تھا۔ ان کے دادا راجہ پیارے لال الفتیؔ اپنے وقت کے معروف فارسی کے شاعر تھے۔ اور جید لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ دہلی دربار سے وابستگی کے سبب ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ دہلی کی تباہی کے سبب وہ عظیم آباد چلے آئے تھے اور اسی سرزمین کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ ان کا فارسی دیوان اور مثنوی 'نیرنگ تقدیر' شائع ہو چکی ہے۔

کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ عظیم آبادی کے گھر پر ماہانہ طرح مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں شہر اور بیرون عظیم آباد کے معروف شعرا شریک ہوتے تھے۔ مشاعرے کی غزلے 'تحفۂ رحمتیؔ' نامی گلدستے میں شائع کی جاتی تھی۔

ایک ایسے ہی مشاعرے کا ذکر سہ ماہی ادراک گوپال پور شمارہ ۲؍ جنوری ۲۰۰۲ء میں کیا گیا ہے، جس میں اردو کے معروف نثر نگار اور شاعر رجب علی بیگ سرورؔ لکھنوی کے شاگرد عبدالحق انجمؔ نے نظامت کے فرائض انجام دیے تھے اور نثر میں اس

مشاعرے اور شعرا کا تعارف کرایا تھا جو ۱۸۷۸ء کے گلدستہ میں شائع ہوا تھا۔ انجم کی نثر کا یہ نمونہ بھی ادراک میں شائع کر دیا گیا ہے۔

رحمتؔی کے اشعار پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روایتی شاعر تھے۔ کنور سکھراج بہادر رحمتؔی کے یہاں ہونے والے مشاعرے ہماری قدیم تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد و یک جہتی کی بہترین مثال کہے جاسکتے ہیں بلکہ رحمتی کو ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ کلچر کا معمار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کنور صاحب کے مشاعرے میں شاؔد عظیم آبادی نے بھی شرکت کی تھی۔ ایک مشاعرے کا حال جس میں شاؔد نے شرکت کی تھی۔ شاؔد کے شاگرد قیس رضوی نے یوں لکھا ہے:

> ''پچاس برس ہوتے ہیں جب حضرت شاؔد بہ سبب انھیں مخالفوں کے مشاعروں کی شرکت ترک کر بیٹھے تھے۔ شہر کے رُکن اعلیٰ جناب کنور سکھراج بہادر رحمتؔی نے ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کر کے اہل شہر کے دہلی، لکھنؤ، رامپور وغیرہ کے نامی شعرا کو اپنے خرچ سے بلوایا۔ کنور صاحب نے حد سے زیادہ کوشش و اصرار شروع کیا کہ مولانا شاؔد بھی شریک ہوں۔ خدا جانے کتنی بار تشریف لائے۔ آخر جس دن مشاعرہ تھا بہ مجبوری شرکت کا اقرار کرنا پڑا۔ شام کے بعد چند غزلیں خلافِ طرح وطرح کی اور ایک قطعہ کہہ کر دو بجے شب کو مشاعرہ میں پہنچے۔ سیکڑوں شعرا کے علاوہ سارے اعیان شہر موجود تھے''(۴۳)۔

رحمتؔی کے یہ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

آئینۂ دل میں ہے میرے یار کی تصویر
گردن جو کبھی میں نے جھکائی نظر آئی

جمال یار کی وہ شمع روشن ہے سرِ محفل
نظر جس کی پڑے دم بھر میں وہ پروانہ بنتا ہے

کسی کی مست آنکھوں پر ہے رحمتِ شاید
کہ اس کے خاک سے بنتا ہے ساغر دیکھتے جاؤ

جب آپ ہی کو پاس نہیں رسم و راہ کا
کیا فائدہ جو ہو بھی ارادہ نباہ کا
یوں جستجوئے یار میں دل بے قرار ہے
بھولا ہوا پھرے کوئی جس طرح راہ کا
سوز دروں سے جل کے جو سرمہ ہے میری خاک
چشم بتاں ملا مجھے گوشہ پناہ کا

جب سلسلہ جنباں یہ تری زلف رسا ہو
عاشق ترا کس طرح نہ زنجیر بہ پا ہو
سنتا ہوں کسی نے اسے بھجوائی ہے مہندی
ایسا نہیں غیروں کا کہیں رنگ جما ہو
(۳۴)

پوچھتے ہیں حال مرغانِ چمن صیاد نے
کھول کر باب قفس کچھ مشتِ پر دکھلا دیے (۳۵)

قطعہ بند:

پھولا رہے یہ چمن ہمیشہ لب پر یہی سخن ہمیشہ
اللہ کرے رہے سرسبز حافظ رہے پنجتن ہمیشہ

رفعتی، منشی شمبھودت (۳۶)

موضع موسیٰ پور پرگنہ سریسا ضلع مظفرپور کے باشندہ، راج دربار دربھنگہ سے وابستہ تھے۔ عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ شعر گوئی کا ذوق بھی اچھا تھا۔ راج پیارے لال الفتی عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ فصیح الدین بلخی نے ان کا ایک فارسی قطعہ تذکرہ ہندو شعرائے بہار میں درج کیا ہے۔ قوم کے کائستھ امبسٹ تھے۔

═══××× ═══

رنگ بہادر پرساد

منشی سنت پرساد کے فرزند۔ سون پور تھانہ نیا گاؤں (سارن) کے باشندہ تھے۔ ۴/ دسمبر ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ کلکتہ یونیورسٹی اور بی. این. کالج پٹنہ میں تعلیم حاصل کی۔ پہلی عالمی جنگ میں کچھ دنوں کام کیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد داناپور ریلوے میں پھر سکریٹریٹ میں ملازمت کی۔ ۱۹۲۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ پھر سیاست میں آگئے اور بہار اسمبلی کے لیے آرا سے کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے۔ آرا میں ٹاؤن اسکول کے پاس رہتے تھے۔ شعر و شاعری کا شوق بھی تھا۔ نصرت آروی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ایک شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

بھروسہ غیر کو ہو گا تمھاری آشنائی کا
یہی طرزِ وفائی ہے تو کس کے آشنا ہو تم (۳۷)

═══××× ═══
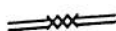
رونق، لالہ شوناتھ سہائے

والد کا نام منشی کشن دیال تھا۔ پکری بروان ضلع نوادہ (بہار) کے رہنے والے تھے۔ اردو اور فارسی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اکبر داناپوری کے شاگرد

تھے۔ خم خانۂ جاوید میں ان کا ذکر اور نمونۂ کلام ملتا ہے:

خوش خرامی میں بھی صاحب کی توجہ چاہیے
دیکھیے دل خاکساروں کے ہیں غلطاں زیرِ پا

وہ دل سے ایسا ہی سمجھیں تو لطف ہے ورنہ
لکھا جو عاشق شیدا خطاب کیا ہوگا

پاؤں میں چھالے، جگر شق، دل میں درد
میں فراق غم کا پُتلا ہو گیا

کس قدر پُر درد ہے رونق زبانِ عندلیب
ہوش اُڑ جاتے ہیں سن سن کر بیانِ عندلیب

بود و نابود انساں کے لیے مثل حباب
ہستی و نیستی ہے اپنی خبر کے مانند (۳۸)

ستم، منشی درگا پرساد

۱۸۴۰ء کے قریب پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی ہیرا لال گیا کے رہنے والے تھے اور قوم کائستھ تھے۔ کیفی گیاوی و سلیمان خاں جادو سے اصلاح لیتے تھے۔ ۵۵ برس کی عمر میں ۱۹۰۶ء میں وفات پائی۔ دو اشعار ملتے ہیں:

رگڑ رگڑ کے جبیں سنگ آستانۂ یار
مٹا دیا نہ ہو تو تجھ کو میرا نام نہیں

ہمیشہ جا جا کے پھر پھر آنا یہی تماشا ہوا کریں گے
ہوا رہے گی خلاف جب تک تو الٹے دریا بہا کریں گے (۳۹)

صاف آئینہ نہ ہو تو وہ صورت نما نہ ہو
صورت نما نہ ہو تو وہ صاف آئینہ نہ ہو
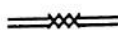
شآد، بدری ناتھ

والد کا نام منشی ہربنس رائے، موضع چندی پور (گیا) کے رہنے والے اور قوم سے کائستھ تھے۔ شآد، گیا کی عدالت میں مختار تھے۔ حسرؔت بیتھوی اور خلشؔ گیاوی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

مکرتے ہو دل میرا مٹھی میں لے کر
بڑے بے مروّت بڑے بے وفا ہو (۴۰)

جوشِ وحشت میں مرا چاک گریباں دیکھ کر
نوک کی لیتا ہے ہر خارِ مغیلاں دیکھ کر

شآد، رائے درگا پرساد

راجہ رام نرائن موزوں کے خاندان کے تے۔ عظیم آباد میں رہتے تھے۔ مردان علی خاں رعنا کے شاگرد تھے۔ گلدستہ تحفۂ انجمن رحمتی مطبوعہ ۱۲۹۵ھ کے شمارے میں درگا پرساد شآد کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ تاریخ شعرائے بہار میں ان کا یہ شعر ملتا ہے:

دن کو جو شغل گریہ ہے تو شب کو آہ کا
پوچھو نہ حال کچھ مرے حالِ تباہ کا (۴۱)

کنور سکھراج بہادر رحمتی کے مشاعروں کے گلدستوں سے ان کی غزلوں سے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں (۴۲)۔ اس غزل میں تیس اشعار ہیں۔

سرسبز ہو یہ چمن ہمیشہ　　قائم رہے انجمن ہمیشہ
ہیں ہجر میں خستہ تن ہمیشہ　　پابند غم و محن ہمیشہ
افسردہ چمن میں دیکھ مجھ کو　　گل رہتے ہیں خندہ زن ہمیشہ
اے جانِ جہاں تمھیں ہے زیبا　　یہ ناز یہ بانکپن ہمیشہ
آخر کو یہی لباس ہوگا　　پہنے ہی رہو کفن ہمیشہ
مرقد میں یادِ رفتگاں سے　　خلوت میں ہے انجمن ہمیشہ
بس دیکھ کے تیری شوخ چشمی　　وحشت میں پھرے ہرن ہمیشہ
ثابت نہ ہوا دہن تمھارا　　باتوں میں رہا سخن ہمیشہ
تیغ ابرو کی یاد میں آہ　　رہتا ہوں میں خستہ تن ہمیشہ
یہ شک ہوا نہ دور چیں سے　　زلفوں میں رہی شکن ہمیشہ
اے دل تو اگر ہے مائل عشق　　پڑھ قصۂ نل دمن ہمیشہ
زنار گلے میں عشق کا ہے　　اس بت کا ہوں برہمن ہمیشہ
پھر خط نہ ہو نکل کے غائب　　سورج میں رہا گہن ہمیشہ
عاشق پائے وصال معشوق　　بلبل کو ملے چمن ہمیشہ
زلف مشکیں کی نکہتوں سے　　مہکے چین و ختن ہمیشہ
اللہ رے جوش قلزم فکر　　مضموں ہے موجزن ہمیشہ
مجھ سے دم بھر کی گرم جوشی　　غیروں سے ہے یہ چلن ہمیشہ

شیریں نے کبھی نہ بات پوچھی
مرتا رہا کوہ کن ہمیشہ

شاؔد عظیم آبادی، بابو سیتا پت

ان کا احوال معلوم نہیں ہوا البتہ ان کا کلام بھی غنیمتؔ کے مشاعروں کی بیاض ۱۲۷۱ھ میں ملتا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

بعد مدت یہ ہوئی صحبت یاراں پیدا
تازہ مضمون کر اے شاؔد سخن داں پیدا
عرض ہے جو ہر عارض کا ترے چہرۂ حور
تیرے کوچہ سے ہوا روضۂ رضواں پیدا
گر کھلیں لعل گہر بار ترے دریا میں
رنگ یاقوت کرے گوہر غلطاں پیدا
سبزۂ خط کی رُخ یار پہ ہے تازہ بہار
فصل گل آئی ہوا باغ میں ریحاں پیدا
شاؔد دل شاد ہو آتی ہے چلی فصل بہار
گریہ ابر سے ہوگا گلِ خنداں پیدا (۴۳)
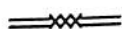
شاؔد، گنگا پرساد

عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کا کلام بھی رائے بیج ناتھ پرساد غنیمتؔ کے مشاعروں کی روداد ۱۲۷۱ھ میں ملتا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

جلوہ گر جس گھر میں تو اے ماہ انور ہو گیا
ماہ ہر روزن ہوا ہر ذرّہ اختر ہو گیا
کس طرح آوے جواب نامہ محو دید ہو
بلبل شیدا گل رُخ کا کبوتر ہو گیا

فصل گل میں کیوں نہیں ملتا ہے بلبل کا دماغ
بیٹھنے سے گل پہ کیا سرخاب کا پر ہو گیا

تو خدائے حسن ہے ملنا ترا معراج ہے
پاس تیرے جو گیا بیشک پیمبر ہو گیا

خیر سے تو ملتفت ہے ہم کو حسرت ہے یہی
جس کو تم ناچیز سمجھے تھے وہ ہمسر ہو گیا

سن کے میرے شعر کو کہنے لگے اہل سخن
شاؔد بھی اس عمر میں کیا ہی سخنور ہو گیا (۴۴)

شائقؔ، منشی للتا پرساد

یہ فرخ آباد کے رہنے والے تھے لیکن عظیم آباد میں ساکن ہو گئے تھے۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

کان ان کے بھر گئے ہیں رقیبوں کی بات سے
سنتے نہیں وہ حال کسی داد خواہ کا (۴۵)

کنور سکھراج بہادر رحمتؔی کے مشاعروں کے گلدستۂ چہارم میں ان کی غزل بھی شامل ہے۔ اسی غزل کا ایک شعر اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے:

نیرنگ دیکھ دیکھ کے اس کارگاہ کا
سالک ہوا نہ کوئی محبت کی راہ کا

اس غزل کے کچھ اشعار یہ ہیں:

واقف نہیں کہ ضد تھی فرشتوں کو مجھ سے کیا
نام عاصیوں میں لکھ دیا مجھ بے گناہ کا

کیا کیا نحوستیں وہ دکھاتا ہے رات دن
شاید زحل ستارا ہے بخت سیاہ کا
خنجر عبث دکھاتا ہے قاتل تو دم بہ دم
مقتول میں تو ہوں تری تیغِ نگاہ کا
کیوں مرغ دل کے واسطے پھندے کی ہے تلاش
خم کم نہیں ہے جال سے زلف سیاہ کا
خوبانِ سبز خط کی جدائی سے ہمدمو!
کاہیدہ جسم پر مرے دھوکا ہے کاہ کا
ڈوبے گا ایک روز تو بحر وصال میں
شائق اگر ہے شوق تہہ دل سے چاہ کا

═══xxx═══

شبنمؔ، بابو بدری ناتھ

بہاری لال فطرتؔ مصنف آئینۂ ترہت کے چھوٹے بھائی۔ خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ اردو و فارسی میں باصلاحیت اور شاعری میں مرشد حسن کامل دھرم پوری کے شاگرد تھے۔ آئینۂ ترہت میں ان کا کچھ کلام ملتا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

غیروں کو تم جو پاس بٹھاتے ہو خوشی سے
یہ رنج تو بندہ سے اٹھایا نہیں جاتا
کہتے ہیں وہ جب بوسۂ رُخ مانگئے شبنمؔ
یہ وہ خزانہ ہے جو لٹایا نہیں جاتا

جو سوزِ دلِ زار لکھنے لگے   قلم بن گیا پھلجھڑی ہاتھ میں
تصور ہے شبنمؔ جو مضمون کا   قلم رہتا ہے ہر گھڑی ہاتھ میں (۴۶)

═══xxx═══

شکیبؔ، منشی ہیرا لال عظیم آبادی

اپنے وقت کے قادر الکلام اور مشّاق شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ کملا پرساد عاجزؔ ان کے شاگرد تھے۔ کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ ۱۲۷۱ھ کی رائے بیج ناتھ غنیمتؔ کے مشاعرہ کی ایک قلمی بیاض سے فصیح الدین بلخی نے ان کی ایک غزل نقل کی ہے جو یہ ہے:

کسی دن نہ ناک بھوں تری اے نازنیں چڑھی
اُتری کب آستین جو تیوری نہیں چڑھی

شوخی سے اپنی گر گئی نظروں سے گل کے یہ
کیوں شاخ گل پہ بلبل اندوہ گیں چڑھی

مر کر بھی ہم اٹھیں گے نہ کوچۂ یار سے
اپنی تو ہے نظر پہ یہی سرزمیں چڑھی

دامن چھوا جنھوں نے سر ان کے اُتر چکے
اب کب تلک رہے گی تری آستیں چڑھی

گل دیکھنے کے لالے پڑیں گے اے عندلیب
صیاد کی نظر پہ اگر تو کہیں چڑھی

رہ جائیں گے دھرے یہ رقیبوں کے داؤ پیچ
اک شب گر اپنی گھات پہ وہ مہ جبیں چڑھی

کیوں کر نہ اس غزل پہ ہمیں ناز ہو شکیبؔ
فکر رسا سے چرخ پہ اس کی زمیں چڑھی (۴۷)
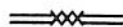
شمسؔ عظیم آبادی، منشی پرمیشر سہائے

یہ بھی عظیم آباد کے باشندہ تھے اور کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ کے مشاعرے میں شریک تھے۔ گلدستہ انجمن تحفۂ رحمتیؔ مطبوعہ ۱۲۹۵ھ میں ان کی غزل بھی شامل ہے اور عبدالحق انجم نے ان کا تعارف کرایا ہے۔ مشاعرے کی غزل کا مطلع یہ ہے:

ہاں یہ مانا کہ جو نکلے بھی تو مر کر نکلے
پر یہ حیرت ہے کہ اس کوچہ سے کیوں کر نکلے (۴۸)

اس غزل کے کچھ اور اشعار یہ ہیں:

دیکھ کے حسن بتاں منھ سے نکلتا ہے درود
پر یہ حیرت ہے کہ اس کوچے سے کیوں کر نکلے

کیوں نہ مٹ جاؤں میں اے دل کہ وہ فرماتے ہیں
آؤں گھر میں ترے میں غیر جو باہر نکلے

شمع کی طرح ہجوم آج ہے پروانوں کا
کیا وہ رکھتے ہوئے سر پر کلہ زر نکلے

شمسؔ مئے نوش نے لکھی یہ غزل فرقت میں
شعر جو نکلے وہ دامن کی طرح تر نکلے
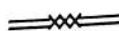
شوقؔ، لالہ ٹیک پرساد

راجہ پیارے لال الفتیؔ عظیم آبادی کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ باصلاحیت اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی صرف ایک نظم ملتی ہے جو یہاں درج کی جاتی ہے:

نظم شوق

جو لکھوں تیری شان میں کم ہے — مظہر جود و فخر عالم ہے
آسماں تیرے آستاں پہ سدا — پئے تسلیم سر کیے خم ہے
مہر بھی تیرے آستانے پر — ذرّہ ساں بندگی میں ہر دم ہے
ماہ طلعت جواں کوئی تجھ سا — دور میں چرخ پیر کے کم ہے
تیرے زورِ شباب کے آگے — صفت پیر زال رستم ہے
تیرے در کا گدا تونگر ہے — جام فقر اس کا ساغر جم ہے
نام نامی ترا سلیماں وار — نقش ہر دل پہ مثل خاتم ہے
بحر فیض آپ کا روانی میں — تشنہ کاموں کے واسطے ہم ہے
ہیں تونگر بھی تیرے دست نگر — تو کرم میں سبھوں سے اکرم ہے
تیرا الطاف بہر دوست ہے قند — قہر تیرا پئے عدو سم ہے
گل ہیں خواہاں نسیم شفقت کے — ملتجی آبرو کی شبنم ہے
شوقؔ خستہ کی یہ دعا حق سے — سحر و شام بس یہ ہر دم ہے

یا الٰہی اسے تو شاداں کر
مہر جب تلک فلک پہ قائم ہے (۴۹)

اس نظم کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ شوقؔ کے کلام میں روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ نظم ان کی قادر الکلامی پر دال بھی ہے۔

صادقؔ، بابو پربھو نرائن

صادقؔ بابو پربھو نرائن مضافات گیا کے رہنے والے تھے اور رانچی کی عدالت میں مختار تھے۔ رسالہ پیام یار لکھنؤ ستمبر ۱۸۸۷ء سے فصیح الدین بلخی نے ان کی ایک

غزل کا ایک شعر نقل کیا ہے، جو یہ ہے:

تعجب کچھ نہیں جل جائے گر عرش
پہنچتے ہیں یہ نالے لامکاں تک (۵۰)

صید گیاوی، لالہ برہم دیو سہائے

لالہ بلدیو سہائے کے صاحبزادے۔ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ انگریزی اور فارسی میں مہارت پیدا کی۔ جہان آباد عدالت میں مختار تھے۔ موضع نجابت پور (جہان آباد) کے رہنے والے تھے۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا اس کے علاوہ فوٹوگرافی، باغبانی، میوزک، ستار و ہارمونیم کا شوق بھی تھا۔ ابتدا میں ستم گیاوی سے اصلاح لی پھر خلش گیاوی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ حیات دوام کے مولف کے مطابق:

"حضرت خواجہ عشرت لکھنوی کی شاگردی کا فخر حاصل تھا" (۵۱)۔
میونسپل کمشنر بھی رہ چکے تھے۔ دیوان بھی مرتب تھا۔
نمونۂ کلام یہ ہے:

جلوہ افگن ہے وہی دونوں جگہ اے ناصح
مرتبہ کم نہیں ہے کعبہ سے بت خانے کا

سزا کس کو ملی، تھا جرم کس کا
لڑی ان سے نظر دل پر لگی چوٹ

مل جل کے رہیں جوہر و شمشیر کی صورت
سیماب ہے دل میرا ہیں آئینہ گر آپ

لیلیٰ پہ دل ہے صدقے محمل کو ڈھونڈھتے ہیں
گم گشتہ کارواں ہیں منزل کو کو ڈھونڈھتے ہیں

ان کی نگاہ دلکش پہلو سے لے گئی ہے
کیوں حاضرین جلسہ اب دل کو ڈھونڈھتے ہیں

دونوں طرف ہے یکساں یوں جذبۂ محبت
قاتل ہمیں تو ہم بھی قاتل کو ڈھونڈھتے ہیں

صنعت پذیر کب ہیں شیوہ کرم ہے جن کا
گھر سے سخی نکل کر سائل کو ڈھونڈھتے ہیں

شوق شہادت ایسا دل میں سما گیا ہے
مقتل کو ڈھونڈھتے ہیں قاتل کو ڈھونڈھتے ہیں

کیا کوئی ظلم تازہ آیا ہے یاد اُن کو
مقتل میں آ کے اپنے بسمل کو ڈھونڈھتے ہیں

نفرت مجاز سے ہے صادق ہے عشق ہم کو
خارج کو چھوڑتے ہیں داخل کو ڈھونڈھتے ہیں

مدّنظر ہے جلنا ہم شکل شمع ہم کو
جو اُف کرے نہ منہ سے اس دل کو ڈھونڈھتے ہیں

اے صیدؔ گم ہوا تو اچھا ہوا مگر ہم
جس نے لیا ہے وہ دل اس دل کو ڈھونڈھتے ہیں

صیدؔ کی سات شعر کی ایک اور غزل ماہنامہ تاجؔ گیا بابت جون ۱۹۲۰ء ص ۲۲۴ - ۲۲۵ پر شائع ہوئی ہے۔ فصیح الدین بلخی نے لکھا ہے کہ کچھ دن ستمؔ گیاوی اور خلشؔ گیاوی سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا (۵۲)۔

ضمیرؔ، کنور ہیرا لال

راجہ پیارے لال الفتی کے فرزند۔ مولد و مسکن شہر عظیم آباد۔ عربی فارسی زبانوں کے ساتھ علم ہیئت و ہندسہ و اقلیدس میں بھی دخل تھا۔ چند سال محکمہ بورڈ کمشنر وافیون میں سرشتہ داری کے عہدے پر ممتاز رہے۔ بطور تفنن غزلیں کہتے تھے۔ ۱۲۵۹ھ میں وفات پائی۔ ان کے دو فارسی اشعار رازؔ بلخی عظیم آبادی نے درج کیے ہیں (۵۳):

از سینۂ سوزاں بہ فلک نالہ فرستیم   وز دیدۂ گریاں بزمیں ژالہ فرستیم
تا نیک نشانش دہد از صورت عالم   نامہ ننویسیم و گل و لالہ فرستیم

═══xxx═══
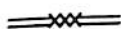
طاہرؔ، بابو پنجاب رائے

منشی چھکن لال زمیندار کے فرزند۔ موضع گھٹون، پرگنہ سریسا (ترہت) کے رہنے والے تھے۔ راجا درگا پرساد شادؔ کی ریاست میں دیوان تھے لیکن زیادہ تر عظیم آباد میں ہی رہتے تھے۔ منشی بہاری لال فطرت نے اپنی کتاب آئینۂ ترہت میں انھیں اپنا چچازاد بھائی لکھا ہے۔ ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کے لیے طاہر نے غزل کہی تھی۔ اس مشاعرے کا گلدستہ منشی نول کشور نے شائع کیا تھا۔ اس گلدستہ میں طاہرؔ کی وہ غزل بھی موجود ہے:

ماشاء اللہ ہے کیا تیرا معطر گیسو
نافۂ مشک ختن سے بھی ہے بہتر گیسو
کیا کروں وصف کہ کیا ہے ترا دلبر گیسو
سنبلستان ارم یا کہ معنبر گیسو
لب سے، آنکھوں سے، زنخدان سے، رخساروں سے
سب سے خوبی میں بڑھا ہے ترا نمبر گیسو

سورج گرہن کا گماں ہوئے مُنجم کو ابھی
رُخِ خورتاب سے مل جائیں جو دم بھر گیسو

عکس سے تاج مرصع کے یہ ہوتا ہے گماں
دشتِ ظلمات میں ہے معدنِ گوہر گیسو

آج کیا ہے کہ پریشانی ہے چہرہ سے عیاں
کیوں سراسر یہ نظر آتے ہیں ابتر گیسو

دسترس کیسے ہو ہے ارض و سما کی دوری
آپ کے پاؤں تو ہیں آج فلک پر گیسو

یہ خطا اپنی ہے خود کردہ رایاں چہ علاج
خود پشیماں ہو چڑھا کے تجھے سر پر گیسو

بال کھولے نہ لب بام تم آؤ ہرگز
کہیں بن جائیں نہ اُڑ جانے کو شہپر گیسو

کیا اُلٹ پھیر ہے کیا شان خدا ہے طاہر
شانہ گیسو پہ کبھی شانے کے اوپر گیسو (۵۴)

═══xxx═══
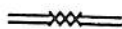
عاجز عظیم آبادی، لالہ کملا پرساد

''حقیقت بھی کہانی بھی'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

''دیوان محلّہ کے رہنے والے تھے اور پٹنہ کے رئیسوں میں تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ سنا ہے بڑے پُرگو تھے مگر ان کا دیوان کیا ہوا پتا نہیں چلتا۔ یہ کنور سکھراج بہادر (رحمتی) کے خاص دوستوں میں تھے'' (۵۵)۔

عزیز الدین بلخی رازؔ عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ:

"منشی ہیرالال شکیبؔ کے شاگرد تھے" (٥٦)۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

برگشتگیٔ بخت کا اپنے یہ ہے اثر
پھرنا مری طرف سے تمھاری نگاہ کا

کرو جو جور وفا کم ہے نہیں کچھ اس کا ہمیں الم ہے
قسم ہے جب تک کہ دم میں دم ہے کبھی نہ ترک وفا کریں گے

چلن لڑکپن کے ہیں نرالے ابھی سے چلتے ہیں بانکپن سے
جوان نامِ خدا جو ہوں گے تو اک قیامت بپا کریں گے

نہ کرتو عاجزؔ بتوں سے الفت اگرچہ ہے ان کی بھولی صورت
یہی ازل سے ہے ان کی فطرت ہمیشہ جور و جفا کریں گے

ہم عشق بتاں چھوڑ تو دیں حضرت ناصح
پر عمر بسر کرنے کی صورت کہو کیا ہے

کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ کے مشاعروں کے گلدستہ میں ان کی غزلیں بھی ملتی ہیں۔ ایسی تمام غزلیات فصیح الدین بلخی نے اپنی کتاب میں نقل کر دی ہیں۔ ایک غزل کے کچھ اشعار اور پیش کیے جاتے ہیں:

ممکن نہیں ہم سے کہ کبھی ترکِ وفا ہو
ہرچند دل اپنا ہدف تیر جفا ہو

اے جذب محبت تری تاثیر سے کیا ہو
خود آکے ملیں وہ جو مرا بخت رسا ہو

انسان ہو پر حسن میں تم سب سے جدا ہو
حوروں سے ہو بہتر کہیں پریوں سے سوا ہو

اے زلفِ معنبر تری کیا ہم سے ثنا ہو
تشبیہ دیں گر مشکِ ختن سے تو خطا ہو

اچھا نہیں ہوتا مرض عشق کا بیمار
وہ درد ہے یہ جس کی نہ عیسیٰ سے دوا ہو

کیا جرم و گنہ کیا مری تقصیر و خطا ہے　　کچھ کھل کے کہو کس لیے تم مجھ سے خفا ہو
کس حسن خداداد ہے اے بت ترا واللہ　　دیکھے جو فرشتہ بھی تو سو جاں سے فدا ہو
بے وجہ نہیں اس فلک پیر کو گردش　　عاشق یہ جوانی پہ کسی کی نہ ہوا ہو
عاجزؔ نہ رکھو چشم وفا ماہ رخوں سے
جب تک کہ بنے تم سے محبت کو بنا ہو

═══

عاجزؔ، منشی لالہ میوا لال

گیا کے رہنے والے تھے۔ محکمۂ پولس میں سب انسپکٹر رہے 'کلید گنجینۂ توحید' کے نام سے ان کے اشعار کا ایک مختصر سا مجموعہ ۱۹۲۷ء میں اور دوسرا 'سرّ توحید' ۱۹۳۰ء میں چھپ چکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

عالم غیب سے عاجزؔ یہی آتی ہے صدا　　کچھ نہیں ہے کہیں مجھ واحد مطلق کے سوا

جلوۂ ذات خداوند تعالیٰ میں ہوں
علم توحید و تصوف کا تجلی میں ہوں
خود ہی طالب ہوں میں اور خود ہی مطلوب اپنا
خود ہی معشوق ہوں خود عاشق شیدا میں ہوں

شب ہجراں ہمارے نالہ وآہ　　عجب کیا ہے ہلا دیں آسماں تک
دل ناداں سمجھتا ہی نہیں کچھ　　بھلا اس کو میں سمجھاؤں کہاں تک

دنیا ہے حقیقت میں خمار ہستی　　ہیں خاک یہ سب نقش و نگار ہستی
جانا نہ صفائی پہ جہاں کی عاجزؔ　　مٹی میں ملائے گا غبارِ ہستی (۵۷)

═══

عارفؔ، شیونرائن چودھری

شیونرائن چودھری متخلص بہ عارفؔ بھی شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کے والد کا نام بابو لالہ چودھری تھا۔ یہ محلہ حاجی گنج عظیم آباد میں رہتے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۴۴ھ میں ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ قیس رضوی نے لکھا ہے کہ اردو کے بڑے حامی اور مختلف وعلوم وفنون کی کتابوں کے مطالعے کے بڑے شائق تھے۔ تصوف سے دلچسپی اور اسلام کے مسائل پر بھی نظر رکھتے تھے۔ بقول قیس:

> ''مسائل توحید اور مسئلہ ہمہ اوست، استعاروں میں نہایت خوبی وسہولت کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ عشق حقیقی ومعرفت کی چاشنی کے جان دادہ ہیں۔ ان کا عشق، محبت خدا، ان کی شراب توحید ومحبت ہے۔ باغ سے دنیا، بلبل سے قاصد، پھول سے رمز خدا وغیرہ مراد ہے اور شراب شیرازی کے بے حد متوالے ہیں'' (۵۸)۔

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:

ازل سے لائے جو مستی تھے اس کی خو نہ گئی
جو تھی خمیر کے اندر وہ رنگ و بو نہ گئی

بہ طنز کہتی ہے پھولوں سے کھلکھلا کے کلی
تمھارا رنگ نہ بدلا ہماری خو نہ گئی

تو خال و خط کے محاسن کو چھوڑ اصل کو دیکھ
مکیں کی زینت و رونق مکاں کو چھو نہ گئی

میں رو کے اشکوں سے خود اپنے ہولیا طاہر
حریم دل میں تری یاد بے وضو نہ گئی

وہ نخل تازہ و تر تھا خیال اے عارفؔ
کہ سوکھ جانے پہ بھی طاقتِ نمو نہ گئی

عاشقؔ، جگر ناتھ پرساد

ان کی تاریخ ولادت ۲۰/ اکتوبر ۱۸۶۱ء ہے۔ والد کا نام بابو منشی رادھا کشن تھا۔ قوم کھتری سرین۔ چھوٹی پٹن دیوی محلّہ عظیم آباد میں رہتے تھے۔ شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ قیس رضوی لکھتے ہیں:

''عاشقؔ ابتدا میں بہت کم سواد تھے لیکن شفیق استاد کی محنت اور ان کے شوق نے حسن کمال پر چار چاند لگا دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو گئے۔ کثرتِ ریاضت اور انہماک مسائل تصوف سے مزاج کا عجب رنگ ہو گیا تھا اور ایسی استغنا پیدا ہو گئی تھی کہ عاشق، حقیقت میں عاشق تن ہو گئے تھے۔ دوست پروری کا وہ عالم تھا جس سے چند ملاقاتیں ہوگئیں، بے اختیار ان کی محبت و الفت کا دم بھرنے لگا۔ مزاج میں اُفتادگی ایسی کہ ہر شخص کے خاک پا ہونے کو تیار۔ بہادر ایسے کہ وقت پڑے تو مال کیا چیز جان دینے کو آمادہ۔ بہ تاریخ ۱۶/ اپریل ۱۸۹۴ء کو کمال ہوش و حواس کے ساتھ اس عالمِ ناپائیدار سے مرض سِل کی تکلیفیں اٹھا کر رحلت کر گئے۔

مفارقتِ روح کے چند منٹ پہلے ایک غزل کہی، جس کا مطلع یہ ہے:

ارادہ ہے کہ اے عاشقؔ بدل دیں   لباس تن بہت میلا ہوا ہے

دیوانِ عاشقؔ معروف بہ کارنامۂ عاشق اگست ۱۸۹۵ء میں چھپا تھا'' (۵۹)۔

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

رہا نہ ہوش ترے عشق میں بجا اپنا
بتوں کو سجدہ کیا جان کر خدا اپنا

گلی میں یار کی اللہ رے بے خودی دل کی
میں سب سے پوچھتا پھرتا ہوں پتا اپنا

ان کے فقروں میں اگر آئے گا　　دل سے کہتا ہوں کہ پچھتائے گا
عالم نزع ہے فرصت کم ہے　　ادھر آنا ہو تو جلد آئے گا
کوچۂ یار میں اک دن عاشق　　چل کے جب پاؤں کو پھیلائے گا
دیکھے گا جو ملے گی راحت　　آپ میں پھر نہ کبھی آئے گا
لطف ہے قبر کی تنہائی ہے　　آنکھ لگ جائے گی سو جائے گا

بن چکا تھا کل جنازہ رہ گیا　　جی اٹھے عاشق تماشا رہ گیا
ہے کوئی جادو نگاہ ناز میں　　آپ نے جس جس کو تاکا رہ گیا
فصل گل تو جا چکی عاشق مگر　　سر میں اب تک اپنا سودا رہ گیا

کیا خوب عشق ہے کہ اسے جانتے نہیں　　مرتے ہیں جس پہ ہم اسے پہچانتے نہیں
ناصح تو مجھ کو قیس کی ہرگز نہ دے مثال　　ہم تو سنی سنائی کبھی مانتے نہیں
خوگر بنا دیا انھیں رونے کا یار نے　　ہنسنا تو طفل اشک مرے جانتے نہیں

قید کچھ دل پہ نہ تھی زلف گرہ گیر میں بھی
ہم تو آزاد رہے خانۂ زنجیر میں بھی
اک حسیں ہم نے تصور میں بنا رکھا تھا
وہی صورت نظر آئی تری تصویر میں بھی
کچھ یہیں پٹنہ میں اخلاص نہیں ہے سب سے
دوست دو ایک ہیں عاشق مرے کشمیر میں بھی

کوئی کہتا ہے مسلماں کوئی آزاد مجھے　　قدرداں خوب ملے ہیں یہ خداداد مجھے

ہر فرق صرف نام کا پر ذات ایک ہے　　تم رام یا رحیم کہو، بات ایک ہے

===×××===
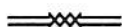
عشرؔت دربھنگوی، منشی راجندر سہائے

منشی اجودھیا پرساد بہاؔر مصنف ریاض ترہت نے اپنی کتاب میں ان کا نام لیا ہے مگر کلام کی بابت نہ کچھ لکھا ہے اور نہ ہی خود نمونۂ کلام پیش کیا ہے۔ منشی اجودھیا پرساد کے زمانے میں موجود تھے۔ یعنی ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء تک حیات سے تھے(۶۰)۔

===×××===

غنیمؔت، رائے بیج ناتھ پرساد

رائے کوشل سنگھ رئیس عظیم آباد کے فرزند غنیمؔت کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کے گھر پر ۱۲۷۱ھ میں عظیم الشان مشاعرے ہوئے تھے۔ فصیح الدین بلخی کو ایک ایسی بیاض ملی تھی، جس میں غنیمؔت کے مشاعروں کا کلام شعرا کے نام و تخلص کے ساتھ درج ہے۔ بقول بلخی ان مشاعروں میں عظیم آباد کے اکثر مشاہیر شعرا شریک ہوئے تھے۔ غنیمؔت کا کلام بھی اس میں ملتا ہے۔ ایسی دو غزلیں فصیح الدین بلخی نے نقل کی ہیں:

بوئے گل کانٹوں پہ صورت جو ذرا دکھلا دو
چاک داماں کرے غنچہ جو قبا دکھلا دو
گرمیٔ آتش بے دودِ حنا دکھلا دو
جا کے گلشن میں گلوں کو کفِ پا دکھلا دو
رات بھر نیند نہیں آئی ہے بے تابی سے

اب تو منہ چاند سا اے ماہ لقا دکھلا دو

سینہ کر چاک دکھاؤں تمھیں دل میں نے کیا
ہنس کے بولا کہ بہت خوب ذرا دکھلا دو

منہ کی خوبانِ پری رو کو کھلاؤ صاحب
آج چل کر کوئی انداز نیا دکھلا دو

بند ناقوس کی آواز ہوئی نالوں سے
اب صنم جلوۂ دیدار ذرا دکھلا دو

گر تمھیں دام میں لانا ہو کسی وحشی کو
زلف پُر پیچ جو ہے دامِ بلا دکھلا دو

چال میں مردے تری چال سے جی اُٹھتے ہیں
ہو بپا حشر جو ٹھوکر کی ادا دکھلا دو

زلف بکھراؤ ذرا چہرۂ نورانی پر
اس غنیمتؔ کو کہیں ملک خطا دکھلا دو (۶۱)

فدویؔ، لالہ سیوک رام

پٹنہ میں دیوانی عدالت کے وکیل تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

جی کو نہ چین ہووے نہ آرام پاوے دل
پھر کس امید پر کوئی تم سے لگاوے دل (۶۲)

سخن شعرا میں مذکورہ بالا شعر کے علاوہ ایک شعر اور ملتا ہے جو یہ ہے:

اوڑھ کر دھانی دوپٹہ بھی اجی آؤ کبھی
ایک دن تو کشت امید غریباں سبز ہو

فصیح الدین بلخی نے یہ دونوں اشعار اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے فدوؔی کا کچھ کلام رائے بیج ناتھ غنیمؔت کے مشاعروں کی ۱۲۷۱ھ کی بیاض سے نقل کیا ہے، جن میں ایک مخمس اور دو طویل غزلیں ہیں۔

مخمس

نے خواہش انساں نہ پری زاد کریں گے　　جی کو نہ غم ہجر میں برباد کریں گے
گل گشت نباتات سے دل شاد کریں گے　　گلزار میں نظارۂ شمشاد کریں گے
یاد اب نہ کسی کا قد آزاد کریں گے

رسوائی عالم کا اگر تجھ کو نہیں ڈر　　او ظالم بے رحم ذرا خوفِ خدا کر
اس دل کے ستانے کی سزا ہو گی مقرر　　دنیا میں نہیں زور تو محشر میں ستم گر
اللہ کے آگے تری فریاد کریں گے

صحبت میں تری لطف جو حاصل ہے مری جاں　　مرنے پہ بھی جانے کے نہیں دل سے یہ ارماں
اس روپ کے صدقے ترے اس ڈھنگ کے قرباں　　حوروں میں کہاں ناز و ادا صورت انساں
جنت میں بھی دنیا کے مزے یاد کریں گے

رہتی نہیں انساں کی سدا ایک سی حالت　　مہماں ہیں دو دن کے یہ سامان مسرت
یہ لطف نہ پھر ہوگا نہ ہوئے گی محبت　　ساقی نہ رہے دور یہ موسم ہے غنیمت
پیری میں جوانی کے مزے یاد کریں گے

غیروں کے لیے ہم سے نہ کر غمزۂ بیجا　　غصہ دلِ غم دیدۂ عاشق کو نہ دلوا
دیکھ او ستم ایجاد جفا پیشہ خدارا　　ہم خاک نشینوں کا ستانا نہیں اچھا
ہل جائیں گے افلاک جو فریاد کریں گے

آئینہ صفت صفحۂ دل کر کے مصفّا　　رکھتے ہیں جو بے مدنظر صورتِ زیبا

فدوی یہی رکھتے ہیں مگر دل میں تمنا　　لکھیں گے سراپا شرر اس لعبتِ چیں کا
کارِ قلم مانی و بہزاد کریں گے (۶۳)

═══
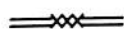
فرد عظیم آبادی، منشی پیارے لال

ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ گلدستۂ عشرتی میں ان کی ایک غزل ملتی ہے۔ یہ غزل نواب لطف علی خاں بہادر کے مکان باولی میں ہونے والے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی:

دام میں اس کے نہ آئے گا جو دانا ہوگا　　دل ہمارا نہ کبھی مائل دنیا ہوگا
لائق سیر نہیں ہے یہ طلسم ہستی　　اس کو سمجھے گا وہی جو کوئی بینا ہوگا
حق شناسی نہیں حصہ میں ہر اک کے یارو　　سو میں دو ایک کا آئینہ سا سینا ہوگا
لاکھ تکلیف پہ تکلیف ہو خالق کے سوا　　کبھی بندہ تو نہیں طالب دنیا ہوگا
فخر کی ان سے نہ ہوگی جو خدا والے ہیں　　وہ برا سمجھے گا اپنے کو جو اچھا ہوگا
جو خدا کا ہوا سمجھو کہ خدا اس کا ہے　　خلق میں پھر نہ وہ محتاج کسی کا ہوگا
زاہدا گلشن فردوس وہی ہے مجھ کو　　کوچہ یار میں مر کر جو ٹھکانا ہوگا
بہر تسکین ترا مثل کہاں سے لاؤں　　نہ کوئی تھا نہ کوئی ہے نہ اب ایسا ہوگا
شعر گوئی کا رہا شوق تجھے گر اے فرد
ہے یقیں خلق میں تو شاعر یکتا ہوگا (۶۴)

═══

فرد عظیم آبادی، بابو کالی پت

ان کے حالات نہیں مل سکے۔ غنیمت کے مشاعروں ۱۲۷۱ھ کی روداد میں

ان کا کلام بھی ملتا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

طاق ابرو سے ہوا کعبۂ ایماں پیدا　　بدلے زمزم کے ہوا چاہ زنخداں پیدا
ٹھوکریں کھاکے ہوں پامال ہر اک وحشیٔ دشت　　چال تیری جو کرے کبک خراماں پیدا
مہندی مَلوا کے رقیبوں سے جلایا ہم کو　　یہ نیا رنگ کیا تم نے مری جاں پیدا
حسن کا یوسف کنعاں کے فقط شہرہ تھا　　تیرا ثانی نہ ہوا پر کوئی جاناں پیدا
ملی اُس شاخ سمن بونے جو مہندی تو کھلا　　شاخ نسریں سے ہوا پنجۂ مرجاں پیدا

نظم پیرائی جو منظور ہے تم کو اے فرؔد
ابتدا ہی سے کرو طرز سخن داں پیدا (۶۵)
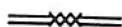
فطرتؔ، منشی بہاری لال

والد کا نام جے کشن لال جو منشی من ہرن لال کے فرزند تھے۔ فطرتؔ کے دادا کا نام منشی سروپ سنگھ تھا۔ یہ سری واستو کائستھ تھے۔ محلّہ لال پوکھر دربھنگہ میں پیدا ہوئے اور یہیں رہے۔ فطرتؔ کی ابتدائی تعلیم زمانے کے رواج کے مطابق عربی فارسی کی کتابوں سے ہوئی۔ مولوی امیر علی الٰہ آبادی سے عربی صرف ونحو کے علاوہ فارسی کی مشہور کتابیں مثلاً مینا بازار، پنج رقعہ، وقائع نعمت خاں عالی، قصائد بدر چاچ، دیوان انوری، دیوان خاقانی، دیوان ناصر علی، دیوان غنی کشمیری اور ابوالفضل کی کتب وغیرہ پڑھیں۔ شعر وشاعری میں مرشد حسن کاملؔ دھرمپوری کے شاگرد تھے۔ عربی فارسی تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم پر توجہ دی اور وکالت کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۷۷ء میں دربھنگہ کی عدالت میں وکیل ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں میونسپل کارپوریشن کے کمشنر منتخب ہوئے۔ آخر عمر تک وکالت کے پیشے سے متعلق رہے۔ تقریباً ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء میں وفات پائی۔

شاعری کی تقریباً تمام اصناف پر قدرت رکھتے تھے۔ نثر نویسی میں بھی کامل تھے۔ ان کی تالیف 'آئینۂ ترہت' ترہت کے تاریخی حالات و واقعات کے علاوہ بہت سے لوگوں کے حالات کی حامل ہے جو ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء میں تالیف کی گئی تھی۔ یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں مطبع بہار کشمیر لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی۔ شاداں فاروقی نے ان کے دیوان کے بارے میں لکھا ہے:

''حضرت فطرتؔ کا ایک قلمی دیوان ان کے خاندان کے افراد میں سے کسی کے پاس موجود ہے''(۶۶)۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

روئے تاباں کو جو دیکھا بولے قامت دیکھیے
آفتاب حشر تو دیکھا قیامت دیکھیے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم اور چھپتے پھرتے ہیں
اپنی نفرت دیکھیے اور میری رغبت دیکھیے
جوڑتے ہیں ہاتھ ہم تم پاؤں دکھلاتے نہیں
اپنی نخوت دیکھیے اور میری منت دیکھیے
جان ہم دیتے ہیں اور تم کھینچتے ہو تیغ تیز
میری الفت دیکھیے اپنی عداوت دیکھیے
ہر گھڑی نام خدا اس بت کو رہتی ہے یہ فکر
چوٹی کنگھی کیجیے اور اپنی صورت دیکھیے
ہاتھا پائی جب میں کرتا ہوں تو کہتا ہے وہ طفل
میری طاقت دیکھیے اور اپنی طاقت دیکھیے
ہم تو کرتے ہیں صفت اور آپ گالی دیتے ہیں
میری عادت دیکھیے اور اپنی عادت دیکھیے

بوسۂ رخسار مانگا تو یہ فرمانے لگے
جا کے منہ دھو آیئے اور اپنی رویت دیکھیے
آپ غیروں سے جو ناحق روز بحثا کرتے ہیں
اپنی عزت دیکھیے اور ان کی عزت دیکھیے
جانب آئینۂ زانو جو دیکھا بول اٹھے
مثل آئینہ کہیں ہوئے نہ حیرت دیکھیے
پیار کی نظروں سے تو کب دیکھتے ہیں آپ ادھر
چتونوں سے قہر ہی کے سوئے فطرت دیکھیے (۶۷)
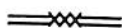
فقیر مظفر پوری، منشی کیولا پرساد

رائے کالکا پرساد کے بیٹے۔ وطن مظفر پور۔ کسی اسکول میں ملازمت کرتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت زبانوں میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ بہت اچھے خوشنویس تھے۔ خورشید رقمی کے دستخط اپنی لکھی وصلیوں پر کیا کرتے تھے۔ ہفت قلم میں مہارت تھی اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ شاعری میں ان کو داروغہ سید مبارک علی طالبؔ سے تلمذ تھا۔ فصیح الدین بلخی رقم طراز ہیں:

"منشی کیولا پرساد ساکن مظفر پور بڑے ذی علم شاعر و ادیب اور خوش نویس تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو میں پوری دستگاہ رکھتے تھے اور خوشنویسی میں 'خورشید رقمی' مشہور تھے۔ صوفیوں سے خاص شغف اور عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت سید شاہ علیم الدین بلخی، سجادہ نشیں خانقاہ فردوسیہ فتوحہ سے مخلصانہ اور عقیدتمندانہ مراسلت

رکھتے تھے"(۶۸)۔

ایک مثنوی میں انھوں نے اپنا مختصر احوال بھی لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگ لال ان کے بزرگوں میں تھے۔فقیر کے دو بیٹے تھے۔ جاگیر ضبط ہونے کے بعد معاشی تنگی ہوگئی تھی۔ مخالفین نے بھی انھیں سخت پریشان کیا۔ مرشد حسن کامل دھرمپوری کے مشاعروں میں شریک ہونے کے لیے اکثر دربھنگہ جایا کرتے تھے۔ شاداں فاروقی کی لائبریری میں فقیر مظفرپوری کے ہاتھ کا لکھا ہوا "ہفت بند کاشی" کا مخطوطہ موجود ہے" (۶۹)۔

فقیر مظفرپوری کے اردو دیوان کا مخطوطہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ اس نسخہ کا تعارف ڈاکٹر سید حسن عباس نے خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۱۱۴ میں کرایا ہے۔ اس دیوان کا نمبر ۱۴۵۹ ہے۔ اس کے پہلے صفحہ کی عبارت جو سرخ روشنائی سے لکھی ہوئی ہے، یہ ہے:

"ایں ہمہ کلمات مناجات وغزلیات ورباعیات وفردیات
وغیرہ تصنیف رائے کیولا پرساد بہ تخلص فقیر، بہ قلم بندہ شتاب رائے ارقام
یافت، در ۱۲۴۷ فصلی بہ مقام بلدہ عظیم آباد محلہ لودی کٹرہ" (۷۰)۔

اس مخطوطے میں ۱۲۵ اوراق ہیں۔ مخطوطہ کچھ کٹا پھٹا بھی ہے، جس سے کئی اشعار ناقص ہو گئے ہیں۔ اس میں وہ مثنوی بھی شامل ہے جس میں شاعر نے اپنے کچھ حالات کی طرف اشارہ کیا ہے اور جس کے کچھ اشعار بلخی صاحب نے نقل کیے ہیں۔ اس قلمی نسخہ میں مثنویاں، غزلیں، رباعی اور کچھ متفرق اشعار ملتے ہیں۔ تندرستی کے بارے میں یہ شعر دیکھیے:

تندرستی ہے نعمتِ عظمیٰ   غیرِ او کاہ میوہ و خرما

بسنت کی تعریف میں فارسی میں تین رباعیاں ملتی ہیں۔ فانی دنیا کے سلسلے میں فقیر مظفرپوری کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

حیات و زندگی کا کیا ٹھکانہ   جب آخر وقت آوے ہو بہانہ
یہ دنیا سراسر ہے خواب و خیال   نہیں ساتھ کچھ بھی دم انتقال

ہمیشہ نہ یہ زندگانی رہے   سمجھ دل کہ آخر کہانی رہے

درج ذیل شعر میں فقیرؔ نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے:

کریں منصفی گر غزل گو فقیر   نہیں کم ز سودا و میر حسن

یہ بھی واضح رہے کہ فقیرؔ مظفر پوری کا فارسی دیوان ۱۸۷۱ء میں مظفر پور سے چھپ چکا ہے۔ اس مطبوعہ فارسی دیوان کا نسخہ بھی خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

فقیرؔ، لالہ لوک ناتھ سہائے

موضع پچھونا پرگنہ نرہٹ ضلع گیا کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۸۴ء کے لگ بھگ شعر و سخن کرتے تھے۔ گلدستہ بہار سے فصیح الدین بلخی نے ان کی یہ غزل درج کی ہے:

گیا ہے سیر گلشن کو جو وہ خنداں وہاں ہو کر
یہ دل کھلا رہا ہے مثل غنچہ بے زباں ہو کر

مجھے درد و الم میں چھوڑ کر غیروں سے ملنے کو
چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر

سنا جاتا ہے کل پھر گلبدن جائے گا گلشن میں
بھلا ہے باغ میں پہلے سے رہنا باغباں ہو کر

ہمیشہ آپ کو ہم جان کا مونس سمجھتے ہیں
نہیں لازم ستم کرنا ندیم دشمناں ہو کر

نہ پرساں اب ہے کوئی حسن کا اے یوسف ثانی
ہوا بازار ارزاں آپ کا پہلے گراں ہو کر

رسائی غیر ممکن ہے فقیؔر اس شاہ کے گھر میں
اگر ہے شوق ملنے کا تو جا اب تابداں ہو کر (۷۱)
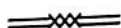
قاصؔر عظیم آبادی، لالہ جگت بہاری لال

محلہ چوالال گلی پٹنہ سیٹی میں رہتے تھے۔ صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

ہوتے ہیں وصل یار کے ساماں نئے نئے
پھر دل میں جمع ہوتے ہیں ارماں نئے نئے

آتا ہے آج سیر کو وہ غیرتِ بہار
بدلے گا اب تو رنگ گلستاں نئے نئے (۷۲)
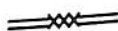
گیسؔو، لالہ نند کشور سنگھ

عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

گیسؔو نہ فکر کیجیے عقبیٰ کی دل سے آپ
دھو دیں گے رو کے اشک سے دفترِ گناہ کا
(۷۳)

جس غزل کا یہ مقطع ہے وہ پوری غزل کنور سکھراج بہادر رحمؔتی کے مشاعروں

کے گلدستہ میں شامل ہے۔ اس غزل میں پندرہ اشعار ہیں۔ بقیہ اشعار یہ ہیں:

کیا کیا ستم ہوا فلک کینہ خواہ کا
لیکن نہ نکلا منہ سے کبھی نام آہ کا

دکھلا دوں گر اثر دل نالاں کی آہ کا
پرزہ اُڑا پھرے فلک کینہ خواہ کا

مانگے جو مجھ سے جان بھی دے دوں ابھی اسے
حالانکہ میں فقیر ہوں پر دل ہے شاہ کا

مہتاب میں جو داغ نمایاں ہے کیا سبب
سایہ پڑا ہے کیا مرا بخت سیاہ کا

قاتل نہ کر تو عاشقوں کو قتل بے خطا
گردن پہ اپنی خون نہ لے بے گناہ کا

ہر روز آپ غیروں سے رہتے ہیں عیش میں
خوش کیجیے ایک دن تو دل اس خیرخواہ کا

کب یہ حسین تجھ سے نباہیں گے دوستی
اے دل خیال رکھتا ہے کس سے نباہ کا

ہمراہی مجھ کو چھوڑ کے تنہا چلے گئے
مشفق نہ حال پوچھیے گم کردہ راہ کا

لخت دل اپنا کھایا ہے خون جگر پیا
فرقت میں اک حسیں برا ہوئے چاہ کا

بدر منیر گھٹتا ہے ہر روز کس لیے
شاید کہ حسن دیکھا ہے اس رشک ماہ کا

اس ہستیٔ دو روزہ پہ دو دن کے واسطے

اے منعمو کرو نہ غرور اپنی جاہ کا
زوروں پہ وحشت آئے تو جڑ سے اکھاڑ دیں
سمجھیں گے کوہ قاف کو ہم برگ کاہ کا
الزام تجھ کو کیا دوں تری کچھ خطا نہیں
اے بت ترا بھلا ہو برا ہوئے چاہ کا
یوں زار ہوں کے تیری گلی میں پڑا ہوں میں
جس طرح راہ پر ہو کوئی برگ کاہ کا
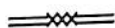
محنتی، منشی ہری ہرناتھ

عظیم آباد کے باشندہ تھے اور وزیر علی عبرتی عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ راز عظیم آبادی نے ان کا فارسی کا ایک شعر درج کیا ہے (۴۷)۔ فارسی اور اردو دیوان زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ کنور سکھراج بہادر رحمتی کے مشاعروں کے گلدستہ میں ان کا کلام ملتا ہے۔

کب تک رہوں خستہ تن ہمیشہ — مغموم بلا محن ہمیشہ
لیلیٰ کے فراق میں بصد آہ — مجنوں رہا نعرہ زن ہمیشہ
شیریں نے کیا کبھی نہ کچھ رحم — محزوں رہا کوہ کن ہمیشہ
یوسف کی تلاش میں تو یعقوب — سونگھا کیا پیرہن ہمیشہ
کیا سود پڑھوں لکھوں جنوں میں — افسانۂ نل دمن ہمیشہ
ایام شباب میں روا ہے — سب رندی و بانکپن ہمیشہ
استاد کی تربیت سے مجھ کو — ہے مشق و کمال فن ہمیشہ
یا ربّ جلیل رحمتی کا — سرسبز رہے چمن ہمیشہ

اب عشق میں مختؔی کو شیؔدا
سب کہتے ہیں مرد و زن ہمیشہ

═══xxx═══
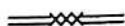
مختؔار، لالہ خوب لال

عدالت میں مختار تھے اسی لیے مختؔار تخلص اختیار کیا۔ عظیم آبادی تعلق تھا۔ رائے بیج ناتھ غنیمؔت کے مشاعروں کی روداد ۱۲۷۱ھ میں ان کا کلام بھی ملتا ہے۔ ایک غزل پیش کی جا رہی ہے۔

گر کروں نظم میں وصف رخِ جاناں پیدا — مطلع نور سے ہو مطلع دیواں پیدا
سرو قد تو ہے دہن غنچہ ہے، عارض گل ہے — تو نے اے شوخ کیا حسن گلستاں پیدا
قد موزوں سے ترے اس کو بھلا کیا نسبت — یہ نزاکت کو کرے سرو گلستاں پیدا
جوش پر آئے ہمارا جو یہ سیلاب سرشک — کشتیٔ نوح سے ہوئے ابھی طوفاں پیدا
ضبط ہرچند کیا سوز دروں کو لیکن — دیدۂ تر نے کیا یہ غم پنہاں پیدا

قدر مختؔار کی لازم ہے سخن دانوں کو
پھر نہ ہوگا کبھی ایسا بھی سخن داں پیدا (۷۵)

═══xxx═══
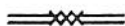
مسؔت، بابو نند کشور لال

والد کا نام منشی جواہر لال گیا کے رئیس اور زمیندار تھے۔ قوم کے کائستھ۔ عالم شباب سے ہی شعر و سخن کا ذوق تھا۔ علمی ذوق بہت صاف، ستھرا رکھتے تھے۔ ۱۹۰۵ء کے بعد انتقال ہوا۔ شاعری میں اکبر داناپوری کے شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

اٹھا بخار دل سے تو آنسو ٹپک پڑے
سچ ہے کہ مینہ نہ برسے گا جب تک گھٹا نہ ہو (۷٦)

صاحب تذکرہ حیات دوام کے مطابق کلام میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ زبان کی چاشنی اور روز مرد قابل داد ہے۔ صاحب دیوان بھی تھے (۷۷)۔ لٹریٹری کلب گیا کے اراکین میں تھے۔ اس کلب کے گلدستہ میں ان کی غزل بھی شامل ہے:

پھر حوصلہ دعا کو ہوا ہے وفا کرے — ظالم جفا سے باز نہ آئے خدا نہ کرے
مفتون صد نگاہ تمنا ہے دل مرا — اس کو کہاں تلک کوئی صرف وفا کرے
صد گونہ حد خضر سے افزوں ہے شوقِ دل — کیا عمر خضر کو کوئی صرف دعا کرے
پھر دیدہ و جگر میں ہیں باہم یہ چشمکیں — تیر نگاہ یار کہاں دیکھیں کیا کریں
پھر تیغ ناز ڈھونڈتی ہے سینہ و جگر — تیر نگہ کو دھن ہے کہ پھر دل میں جا کرے
پھر جب کو ہوس ہے کہ ہو یوں وہ تار تار — ممنون بخیہ گر نہ طبیعت ہوا کرے
پھر گرم آہ شعلہ فشاں ہے دل حزیں — پھر گریہ چاہتا ہے کہ طوفاں بپا کرے
پھر عشق چاہتا ہے ترے آستانہ پر — بامنت و نیاز مجھے جبہ سا کرے
میرے غبار کو ہے خیال عروج پھر — تا زیر بار منت دوش صبا کرے
پھر امتحان جذبۂ دل کو چلی ہے یاس — تا مہرباں ہو وہ بت کافر خدا کرے
پھر میرے سر پہ کھیل رہی ہے اجل مری — شمشیر ناز تن سے مرا سر جدا کرے

کیا پھر ہے میکشی کا تہیہ جناب مستؔ
زاہد سے کہہ دو ابر کی اس دم دعا کرے
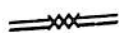
مسلماؔن، لالہ بختاور سنگھ

پٹنہ کے مغل پورہ محلّہ میں رہتے تھے۔
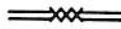
مشہوؔر عظیم آبادی، حکیم پچھمی پرساد

حکیم پچھمی پرساد مشہوؔر عظیم آبادی طبابت کے پیشے سے وابستہ ہونے کے ساتھ شعر و شاعری خاص کر ظریفانہ شاعری سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔فن طب پر کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں جن کا ذکر حکیم اسرار الحق نے اپنی کتاب 'تاریخ اطبائے بہار' جلد دوم میں کیا ہے۔ ان کی شاعری کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ ان اشعار میں بھی انھوں نے طبی اصطلاحیں اور کتابوں کا نام استعمال کیا ہے۔

مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں
مگر ہے اس ...... کے مینا میں بوتل میں کنٹر میں

نہ پایا مادّہ اس کا حکیموں نے بہت دیکھا
کفایہ میں قرابادین میں بحر الجواہر میں

کہو مشہوؔر تم نے سیکڑوں پھیرے کیے کیوں ہیں
گلی میں راستے میں راہ میں بازار میں گھر میں(۷۸)

کنور سکھراج بہادر رحمتؔی کے مشاعروں کے گلدستوں میں بھی ان کا کلام ملتا ہے جن میں سے ایک غزل یہ بھی ہے:

مشتاق ہو اگر تو ہو عاشق پناہ کا — امیدوار ہو تو اسی بارگاہ کا
اب عابدوں سے کوچۂ جاناں تو بس گیا — احوال ہے خراب ہر اک خانقاہ کا

اب دل میں بغض بیٹھ گیا ذکر اٹھ گیا الفت کا دوستی کا محبت کا چاہ کا
دربار حسن میں ہے برابر مقدمہ مفلس کا بینوا کا توانگر کا شاہ کا
مشہور ہو کہاں اب کس کا ساتھ ہے
ہر وقت کا ہمیشہ کا شام و پگاہ کا
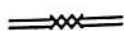
مطلبؔ دربھنگوی، منشی مہاراج سنگھ

ولد منشی درباری لال، قوم کائستھ، دربھنگہ میں رہتے تھے۔ اردو اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ منشی بدری ناتھ شبنمؔ کے شاگرد تھے۔ تقریباً ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں وفات پائی۔

ہندوؤں میں اردو کے مؤلف رفیق مارہروی نے تذکرہ دیبی پرساد کے حوالے سے تین اشعار اور تذکرہ گلزار سخن (ص ۳۸۹) سے ایک غزل پیش کی ہے۔

نمونۂ کلام:

عمارت کی بنا ہم کیا کریں خاک ثبات اک دم نہیں ہے قصر تن کا
ہمیشہ ٹیڑھے وہ رہتے ہیں ہم سے گھمنڈ ان کو ہے اپنے بانکپن کا
دہن میٹھا ہوا اپنا بھی مطلبؔ کیا جب وصف اس شیریں دہن کا (۷۹)
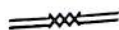
مضطرؔ، بابو گوبردھن لال

ان کے والد مارواڑ سے پٹنہ آ کر بس گئے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ مضطرؔ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ پرانی طرز تعلیم کے مطابق انھوں نے بھی تعلیم حاصل کی اور اردو اور فارسی پر تسلط حاصل کیا۔ والد کے انتقال کے بعد یہ بھی تجارت کے کاموں

میں مشغول ہو گئے۔ عظیم آباد کے شعری ماحول سے متاثر ہو کر یہ بھی شعر و شاعری کرنے لگے۔ کبھی کبھار شعری نشستیں اپنے گھر پر بھی آراستہ کرتے تھے۔

کنور سکھراج بہادر رحمتؔ کے مشاعروں میں یہ بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ دو اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

کہتی ہے روح تن سے نکلنے کے واسطے
اتنے ہجوم غم ہیں کہ رستا کہاں مجھے
مملو عتاب سے ہے ہر اک حلقہ زلف کا
بتلا تو لے کے جاتا ہے اے دل کہاں مجھے (۸۰)

═══
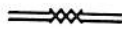
منتظرؔ، منشی مہادیو پرساد

ریاض ترہت کے مصنف منشی اجودھیا پرساد بہارؔ کے چھوٹے بھائی۔ وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ انھیں بھی عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں میں اچھی مہارت حاصل تھی۔ شاعری سے بھی یک گونہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنے بھائی بہارؔ سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ ان کا کلام بھی دستبرد زمانہ کا شکار ہو گیا۔ ریاض ترہت میں ایک فارسی غزل ملتی ہے(۸۱)۔ ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء تک بقید حیات تھے۔

═══
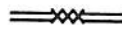
نسبتؔ، منشی رگھوناتھ پرساد

مقصود عالم رضوی مقصودؔ کے شاگرد اور پہانی کے رہنے والے تھے۔ ایک شعر ملتا ہے:

استخواں ہر ایک سوزِ غم سے جل کر رہ گیا

شمع کے مانند دل غم سے پگھل کر رہ گیا(۸۲)

═══
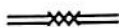
نسیمؔ عظیم آبادی، بابو ہری ہر چرن

ان کی غزلیں بھی رائے بیج ناتھ غنیمتؔ کے مشاعرہ ۱۲۷۱ھ کی بیاض میں ملتی ہیں۔ زیادہ حال نہیں ملتا۔

نمونۂ کلام:

دستِ رنگیں کا ترے مجھ کو جو سودا ہو جائے
یدِ بیضا مجھے ہر آبلۂ پا ہو جائے

نرگسی چشم کو گل اس کے جو دیکھوں میں کہیں
خار آنکھوں کے تلے نرگس شہلا ہو جائے

اس کی فرقت میں ان آنکھوں کو رواں رکھتا ہوں
کوئے جاناں نہ کہیں سیل سے دریا ہو جائے

ٹیڑھے معلوم ہوں یہ سرو سہی باغ میں سب
گر تصور میں کہیں وہ قد بالا ہو جائے

شوخیٔ غنچہ بہت دیکھ رہا ہوں میں نسیمؔ
باغ میں ہنس کے وہ بولے تو یہ رسوا ہو جائے(۸۳)

═══
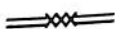
نظرؔ، بابو باسدیو داس

آرہ کے رؤسا میں تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اور قمرؔ آروی کے شاگرد تھے۔ مگر ان کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ اپنے استاد قمر

آروی کی مثنوی سراج دولت کا قطعۂ تاریخ طباعت کہا تھا، وہ مذکورہ مثنوی کے ہمراہ ضرور ملتا ہے لیکن یہ فارسی میں ہے:

نظم رنگیں قمؔر در عالم　　ہست عزت دہ گلزار بہشت
سن طبعش نظؔر از فکر رسا　　محنت شاقہ نظم نوشت (۸۴)

اس قطعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قمؔر کی مثنوی ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی تھی۔
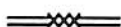
نندؔ دربھنگوی، لالہ سدا نند

موصوف دربھنگہ کے رہنے والے تھے اور دربھنگہ راج کے یہاں ملازمت کرتے تھے۔ ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء تک بقید حیات تھے۔ ان کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے مگر کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ یہ قطعۂ تاریخ بزبان فارسی ملتا ہے جو انھوں نے 'ریاض ترہت' کی اشاعت کے موقع پر کہا تھا (۸۵):

از رہ لطف کردار شادم　　بندہ پرور کریم و بندہ نواز
بنگارید سال تاریخی　　داشتم فرق بر زمین نیاز
فکر کردم بہ سال تاریخش　　عرض کردم کہ شد 'غریب نواز'
۱۲۷۶ف
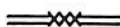
وکیؔل دھولپوری

لالہ لچھمی نرائن وکیؔل۔ ان کی ایک مزاحیہ غزل ایک قلمی بیاض سے فصیح الدین بلخی نے نقل کی ہے جو پٹنہ یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ وہ مزاحیہ غزل یہ ہے:

ہر قطرۂ سرشک کو گوہر بنا دیا　　آنکھوں نے اپنی ہم کو دھنتر بنا دیا

اب تم مجھے ستاتے ہوئے جان کس لیے　　کپڑے تمھیں بنا دیے، زیور بنا دیا
ہو جاتا قرب مجھ کو بھی محمل نشین کا　　اللہ نے نہ کیوں مجھے اختر بنا دیا
آتے ہیں جھوم جھوم کے اس در پہ ابرِ غم　　آنکھوں نے میری ہتھیا نچھتر بنا دیا
فیصل ہوا نہ رنج و الم کا مقدمہ　　گو دل کو میں نے ڈپٹی کلکٹر بنا دیا

کم ظلّ بوم سے نہیں پَرتو وکیل کا
جس باغ پر پڑا اسے کھنڈر بنا دیا(۸٦)
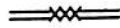
حواشی

(۱) رجوع کریں۔ رضی احمد : بہار کی اردو شاعری میں شاؔد کے ہندو تلامذہ کا حصہ (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، بہار یونیورسٹی مظفرپور، ۱۹۸۷ء)، گلشن حیات، ص۷۵-۷٦۔ حقیقت بھی کہانی بھی، ص ۵۔
(۲) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۰۵-۱۰٦۔
(۳) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ص ۴٦-۴۷۔
(۴) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۸۳۔ بزم شمال ص ۱۹۰۔
(۵) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۵-۹۱۔ حقیقت بھی کہانی بھی، ص۴۵۹۔
(٦) تاریخ شعرائے بہار، ص ٦٦۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۳۴ - ۳۵۔
(۷) ہندو شعرا: خواجہ عشرت لکھنوی، ص ۱۰۔
(۸) تاریخ شعرائے بہار، ص ۸۹۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۷۴۔
(۹) تاریخ شعرائے بہار، ص ۸۹۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۹۱-۹۴۔
(۱۰) تذکرہ بزم شمال، ص۱۲۴۔

(۱۱) تاریخ شعرائے بہار، حصہ دوم (قلمی مسودہ)۔تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۵۔

(۱۲) تذکرہ بزم شمال، ص۲۶۳ - ۲۶۴۔

(۱۳) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۴۲ - ۴۳۔

(۱۴) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۴۶۔

(۱۵) تاریخ شعرائے بہار، ص ۹۶۔ بزم شمال، ص ۸۲۔تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۳۶۔

(۱۶) تاریخ شعرائے بہار، ص ۹۸۔

(۱۷) ہندو شعرا، ص ۱۳۴۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۰۳۔

(۱۸) آرا: ایک شہر سخن، ص ۲۲۳۔تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۲۔

(۱۹) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۵۴-۵۵۔

(۲۰) آرا: ایک شہر سخن، ص ۲۹۷-۲۹۸۔

(۲۱) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۰۰۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۹۸۔

(۲۲) بزم شمال، ص ۱۳۳۔

(۲۳) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۰۲۔

(۲۴) بزم شمال، ص ۱۴۳۔ آئینۂ ترہت، ص ۲۳۴۔

(۲۵) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۷۰-۷۴۔

(۲۶) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۹۹۔

(۲۷) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۲۔ آرا: ایک شہر سخن، ص ۲۳۵۔

(۲۸) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۰۷۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۳۶۔

(۲۹) تذکرہ شعرائے بہار، ص ۳۵-۳۶۔

(۳۰) ہندو شعرا، ص ۵۸۔

(۳۱) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۴۵۔

(۳۲) آرا: ایک شہر سخن، ص ۴۲۸ - ۴۲۹۔

(۳۳) گلشن حیات، ص ۳۲۔

(۳۴) حقیقت بھی کہانی بھی، ص ۳۷۴۔

(۳۵) ہندو شعرا، ص ۶۳۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۹۵-۹۷۔

(۳۶) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۴۱۔ بزم شمال، ص ۸۴۔

(۳۷) آرا: ایک شہر سخن، ص ۴۳۱۔

(۳۸) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۹۵۔

(۳۹) ہندو شعرا، ص ۷۵۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۵۔

(۴۰) ہندو شعرا، ص ۷۶۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۰۶۔

(۴۱) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۱۴۔

(۴۲) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۷۵۔

(۴۳) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۶۸۔

(۴۴) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۶۱۔

(۴۵) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۱۸۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۰۔

(۴۶) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۴۸-۴۹۔

(۴۷) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۳۸۔

(۴۸) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۱۸۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۰۔

(۴۹) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۳۷-۳۸۔

(۵۰) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۴۔

(۵۱) حیاتِ دوام، ص ۱۴۵-۱۴۶۔

(۵۲) ماہنامہ تاج، گیا، مئی ۱۹۲۰ء، ص ۱۸۵۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۰۳۔

(۵۳) تاریخ شعرائے بہار، ص ۴۷۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۳۶۔

(۵۴) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۷۹-۸۰۔ بزم شمال، ص ۱۴۲۔

(۵۵) حقیقت بھی کہانی بھی از بدر عظیم آبادی، ص ۴۷۵۔

(۵۶) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۳۴۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۶۲۔

(۵۷) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۳-۸۴۔

(۵۸) گلشن حیات، ص ۱۱۸۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ......

(۵۹) گلشن حیات، ص ۱۱۴-۱۱۵۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۰۵۔

(۶۰) بزم شمال، ص ۱۳۵۔

(۶۱) تذکرہ شعرائے بہار، ص ۶۷۔

(۶۲) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۳۷۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۵۷۔

(۶۳) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۵۸۔

(۶۴) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۹۸۔

(۶۵) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۶۹۔

(۶۶) بزم شمال، ص ۱۵۷-۱۵۸۔

(۶۷) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۴۷-۴۸۔

(۶۸) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۴۹۔

(۶۹) بزم شمال، ص ۱۳۰۔

(۷۰) منشی کیولا پرساد فقیر مظفر پوری خورشید قمی اور دیوان فقیر کا نسخۂ خدا بخش: ایک تعارف از سید حسن عباس، خدا بخش جرنل، ص ۱۲۵۔

(۷۱) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۴۵-۴۶۔

(۷۲) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۴۳-۱۴۴۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۱۔

(۷۳) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۴۸۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ص ۸۱-۸۲۔

(۷۴) تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۵۰۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۴۲-۴۳۔

(۷۵) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۶۱۔

(۷۶) ہندو شعرا، ص ۱۱۳۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۰۱-۱۰۲۔

(۷۷) حیات دوام، ص ۱۶۷۔

(۷۸) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۹۴۔ تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۵۱۔ بہار میں اردو طنز و ظرافت، ص ۳۹-۴۰۔

(۷۹) تذکرہ بزم شمال، ص ۱۳۸۔

(۸۰) حقیقت بھی کہانی بھی، ص ۵۳۶۔

(۸۱) بزم شمال، ص ۱۲۸۔

(۸۲) تذکرہ سخن شعراء نساخ، ص ۵۱۷۔ آرا: ایک شہر سخن، ص ۲۸۵۔

(۸۳) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۶۵۔

(۸۴) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۸۳۔ آرا: ایک شہر سخن، ص ۲۹۱۔

(۸۵) بزم شمال، ص ۱۳۴۔

(۸۶) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۴۶۔ بہار میں اردو طنز و ظرافت، ص ۳۹۔
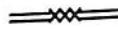
(ج) شعرائے متاخرین

۱۳۰۱ھ تا اب تک

اثرؔ، بابو امر ناتھ

والد کا نام لالہ لکھی رام صابرؔ، یہ پنجاب کے لدھیانہ ضلع کے رہنے والے تھے مگر ریلوے کی ملازمت کے سبب کافی دنوں سے صاحب گنج میں مقیم تھے۔ شاعری کا ذوق وراثتاً پایا تھا۔ اثر کی ولادت ۱۹۱۱ء میں رائے کوٹ (لدھیانہ) میں ہوئی تھی۔ بچپن سے شعر و شاعری کی طرف طبیعت مائل رہی۔ ۱۹۳۰ء سے ان کا کلام اخبارات میں چھپنے لگا اور اسی سال لاہور کے ایک اخبار 'اتفاق' کے مدیر بھی ہوئے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

میں زندگی کے سہارے تلاش کرتا ہوں ۔۔۔ تری نظر کے اشارے تلاش کرتا ہوں
نہ گر پڑے ہوں خجالت سے دیکھ کر تجھ کو ۔۔۔ زمیں پہ چاند ستارے تلاش کرتا ہوں
کنار جو ہو، شب مہ ہو، تو ہو اور میں ہوں ۔۔۔ وہ دل فریب نظارے تلاش کرتا ہوں
نہ جانے کون سے گوشے میں پڑ رہے ہوں گے ۔۔۔ ترے فراق کے مارے تلاش کرتا ہوں
وہ شوق دل جو تجھے عجز و انکسار کے ساتھ ۔۔۔ حضور کہہ کے پکارے تلاش کرتا ہوں
دلِ حزیں جو کبھی غم گسار رہتے تھے ۔۔۔ کہاں ہیں دوست تمھارے تلاش کرتا ہوں

خدا ہی پار لگائے گا اے اثرؔ کہ ہے اب
بھنور میں ناؤ، کنارے تلاش کرتا ہوں (۱)
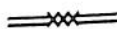
اسیرؔی، اکھوری نند کشور

والد کا نام اکھوری بھکاری لال۔ بہاری (ضلع گیا) کے رہنے والے تھے اور قوم کے کائستھ تھے۔ عدالت میں مختار اور خلشؔ گیاوی کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام

ملاحظہ ہو:

ہر وقت ستاتے ہو جو ارباب وفا کو　　کیا حشر میں تم منہ نہ دکھاؤ گے خدا کو
کوچہ سے ترے اٹھ کے کہیں جا نہیں سکتا　　آرام ملا وہ مرے نقش کفِ پا کو (۲)

۱۹۱۶ء میں بقید حیات تھے۔

═══
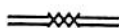
اشونی کمار اشرؔف

اشونی کمار اشرؔف، بہار کے عصر حاضر کے ایک خوش فکر و خوش گلو شاعر ہیں۔ آپ کی ولادت ۲۱ر جنوری ۱۹۵۵ء کو ہوئی۔ والد کا نام شری مہیشور نرائن سنہا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ساتویں جماعت پٹنہ بلائنڈ اسکول سے، ۱۹۷۰ء میں میٹرک پرائیوٹ طور پر ۱۹۷۴ء میں بہار یونیورسٹی مظفر پور سے فلسفہ میں بی. اے. (آنرز) اردو کے ساتھ پاس کیا۔ بیسٹ گریجویٹ کا خطاب بھی۔ ۱۹۷۶ء میں فلسفہ میں ایم. اے. اور ۱۹۸۹ء میں پی ایچ. ڈی. کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۸ء میں سندری کالج سندری میں ملازمت کا آغاز کیا اور ۱۹۸۰ء تک وہاں رہے۔ ۱۹۸۰ء سے ۶ر جولائی ۲۰۰۶ء تک ایم. جے. کے. کالج، بتیا (مغربی چمپارن) میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے اور ۷ر جولائی ۲۰۰۶ء کو ایم. پی. سائنس کالج، مظفر پور، شعبۂ فلسفہ میں منتقل ہو گئے۔ مظفر پور ہی میں اب مستقل طور پر ساکن ہو گئے ہیں۔ اشرؔف، اردو مشاورتی بورڈ بہار کے ممبر اور بہار اردو اکادمی پٹنہ کی جانب سے ۲۰۰۴ء میں غیر مسلم اردو داں کا انعام حاصل کر چکے ہیں۔

اردو شاعری سے گہری رغبت نے انھیں خود شعر کہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ مشاعروں میں بھی اپنی آواز اور کلام کا جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ افسوس کہ ابھی تک ان کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہو سکا۔ موجودہ دور کی کساد بازاری کے پیش نظر اشونی

کمار اشرؔف کا دم غنیمت ہے جو اردو شاعری کی جوت جگائے ہوئے ہیں اور اپنے کلام کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

(۱)

فرقت کی راتوں کے مقابل قربت کی شب کیا ہوگی
یاں ہو گا جشنِ بیداری واں فکرِ فردا ہوگی

اشک بداماں وادیٔ مجنوں میں جس شب لیلیٰ ہوگی
آگ لگے گی تیرہ بنوں میں سنگ سنگ تیز ہوا ہوگی

دل شکنی ارماں شکنی پیماں شکنی سب جانے ہے وہ
عرض فغاں سے عاجز ہیں ہم، ہم سے محبت کیا ہوگی

استغنا کا روگ لگے گا جب بھی عشق کے ماروں کو
خودداری کی جیت تو ہوگی دل داری رسوا ہوگی

چھین سکا کب چھین سکے گا جبر ردائیں حرمت کی
جب بھی ستم کے ہاتھ بڑھیں گے رحمت سر پہ ردا ہوگی

چارہ گری سے درد دروں کا اشرؔف درماں کیا ہوگا
جتنا کرو گے غم کا مداوا شدتِ درد سوا ہوگی

---

(۲)

تلاش حق میں افسانوں سے بچیے　　پسِ مسجد صنم خانوں سے بچیے
سجانا ہو اگر گلزارِ ہستی　　تو نا آسودہ ارمانوں سے بچیے
خزاں بر دوش ہے بادِ بہاری　　چمن میں رہ کے ویرانوں سے بچیے
سرورِ تشنگی ان میں نہاں ہے　　جناب رند پیمانوں سے بچیے

کہیں صحرا نہ کر دیں خواب گاہیں ۔۔۔ رہِ الفت میں فرزانوں سے بچیے
نہ جانیں کون سا پردہ اٹھا دیں ۔۔۔ اندھیری شب میں دیوان سے بچیے

سوا اُس کے ہے اشرؔف کون کس کا
زمانے کے نگہبانوں سے بچیے

---

(۳)

نیرنگیٔ رُخ اور ہے ابرو کی کماں اور
یہ آتش حوں اور ہے وہ برق تپاں اور

پہلے ہی بار ہجر سے انساں ہے مضمحل
اب اس سے نہ اٹھے گا کوئی بارِ گراں اور

وہ کھولتے نہیں کبھی پلکوں کی کھڑکیاں
ان کو ہے ڈر کرے نہ مکیں نقل مکاں اور

صحرا نژاد ہیں ہمیں مت دیکھ اے نسیم
دیکھے تو بگڑ جاتی ہے کچھ شکل خزاں اور

مدت سے ہیں گردیدہ رہِ شوق میں اشرؔف
پیچھا کرے ہمارا ابھی عمر رواں اور

---

(۴)

حسرت دیرینہ کو خوابِ پریشاں کہہ دیا
پاسِ دل کچھ بھی نہ رکھا دل کو ارزاں کہہ دیا

ریگ صحرا وادئ وحشت کے ہے حلقہ بگوش
دشت کو آوارگی نے پا بہ جولاں کہہ دیا

خواب پلکوں پر سجے جیوں ہی، لب گلنار نے
بند ہونے کو ہے اب ایوانِ رنداں کہہ دیا

کس چمن کے پھول پر تیغ خزاں چلتی نہیں
کیا ہوا گر اس نے گلشن کو بیاباں کہہ دیا

روز و شب کی اک نئی تعریف مے خواروں نے کی
دن کو ویرانہ کہا شب کو گلستاں کہہ دیا

شرح حسن و عشق جب اشرفؔ نہ ہم سے ہو سکی
ایک کو کافر کہا اک کو مسلماں کہہ دیا

---

(۵)

یہ شرم یہ حیا یہ ندامت تو دیکھئے
اسلوب پردہ داریٔ الفت تو دیکھئے

ہے زلف میں شب رُخ پہ سحر دوش پر گھٹا
کافر کی عامرانہ حکومت تو دیکھئے

کہتا ہوں جان بوجھ کے چشمہ سراب کو
خود کو بھلانے کی مری عادت تو دیکھئے

فردوس عاشقاں لب و مژگاں میں قید ہے
دوشیزگی میں سمٹی قیامت تو دیکھئے

جس پر قصیدے پڑھ کے خدا بن گئے ہیں آپ
اک بار کر کے اس کی شکایت تو دیکھئے

اک فاقد البصر کو سخنور بنا دیا
اشرفؔ پہ کردگار کی رحمت تو دیکھئے

---

(۶)

ستم نصیبوں کا یہ فلسفہ بھی اچھا ہے ‌ ‌ رہِ وفا میں صنم بے وفا بھی اچھا ہے
بُرے نہ ہوں تو نصیحت نہ ہو بھلائی کی ‌ ‌ اسی لیے تو جہاں میں بُرا بھی اچھا ہے
جو ہوگا ٹھیک ہی ہوگا یہ ٹھیک ہے لیکن ‌ ‌ جو ہو چکا ہے وہ سب کچھ ہوا بھی اچھا ہے
اگر بُرائی تجھے ایک آنکھ بھاتی نہیں ‌ ‌ تو پھر یہ طے ہے کہ تیر خدا بھی اچھا ہے
کوئی دکھائی نہ دے تا کہ خود کو دیکھ سکوں
یہ اس کا میرے لیے فیصلہ بھی اچھا ہے

---

(۷)

میں چاہوں بھی تو ہمسایوں کے جیسا ہو نہیں سکتا
وہ دریا بن سکتے میں صحرا ہو نہیں سکتا

محبت ہی سے مسجودِ ملائک نوعِ انساں ہے
محبت کرنے والا شخص رُسوا ہو نہیں سکتا

مثال عشق رب دنیا کی چاہت ہو نہیں سکتی
جو اس میخانے سے پی لے وہ پیاسا ہو نہیں سکتا

دلوں کے بھید کہنے کو فقط اک لفظ کافی ہے
کوئی نغمہ لکھا جائے ادھورا ہو نہیں سکتا

اذیت، قتل و غارت، اغوا کاری بے گناہوں کی
کسی کا ہو یہ قرآں کا طریقہ ہو نہیں سکتا
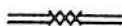
اشکؔ گیاوی، کیدار ناتھ

ایک معزز کائستھ خاندان سے تعلق تھا۔ اردو دوستی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ شیخ نبی بخش ساکن موضع اٹکو ہوا کی زیر تربیت انھیں شاعری کا شوق ہوا اور بسمل سہنساروی سے مشورۂ سخن کیا۔ گیا پولس میں ملازم تھے۔ حقیقت نگاری اور صاف گوئی ان کا خاص وصف تھا۔ نمونۂ کلام:

ہمدرد کون اشکؔ ہے اپنا کسے سنائیں
افسانہ بےبسی کا غم بے حساب کا (۳)

═══xxx═══
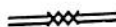
اصغرؔ، منشی بہاری لال

آرا میں وکیل تھے اور بدرؔ آروی کے ہم عصر تھے۔ صرف ونحو اور عروض پر ایک قواعد فارسی مطابق قواعد انگریزی ۱۸۹۹ء میں لکھی تھی (۴)۔ کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

═══xxx═══
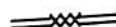
افسرؔ، بابو بکرما دت لال

سہسرام کے رہنے والے اور احقرؔ سہسرامی کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام کے طور پر ایک شعر ملتا ہے:

ہلال اہل زمانہ کو ہے سبق آموز
کہ رفتہ رفتہ میسر کمال ہوتا ہے (۵)

═══xxx═══

امیرؔ، بابو گوبردھن پرساد

محکمۂ پولس میں انسپکٹر تھے۔ کبھی سپول میں مقیم تھے۔ وہیں سے 'گلدستہ بہارِ بے خزاں' بریلی کے لیے اپنا کلام برائے اشاعت بھیجا تھا۔ ان کی غزلیں اپریل، مئی، اگست اور ستمبر ۱۹۰۳ء کے شماروں میں شائع ہوئی تھیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

مجھ سے ہر آدمی کو نفرت ہے یہ ترے عشق کی بدولت ہے
غیر بھی کرتے ہیں گلہ تیرا کچھ مجھی کو نہیں شکایت ہے
مردے اٹھنے لگے مزاروں سے ان کا آنا بھی اک قیامت ہے
واعظو جاؤ اپنا کام کرو کوئے جاناں ہماری جنت ہے
کیا تردد ہو اپنے مدفن کا کوچۂ یار تو سلامت ہے
بوسہ مانگا تو منہ بنا کے کہا ایسی باتوں سے مجھ کو نفرت ہے
توبہ مئے سے بہار میں واعظ یہ بھی اک آپ کی حماقت ہے
اپنے دل کا مجھے گلہ ہے امیرؔ
کچھ نہیں غیر کی شکایت ہے

جاں ستاں ابروئے قاتل کی ادا ہوتی ہے
اسی تلوار کے قبضہ میں قضا ہوتی ہے
ہم کو دنیا میں نہ آرام ملا سنتے تھے
جائے آرام مسافر کو سرا ہوتی ہے
الفت غیر کا الزام میں دیتا ہوں انھیں
بس اسی بات پہ جھگڑے کی بِنا ہوتی ہے
دیکھا عاشق کا جنازہ تو ستم گر نے کہا
وہی ہوتا ہے جو مرضئ خدا ہوتی ہے

اس کو شمشیر بکف دیکھ کے مقتل میں امیرؔ
روح دہشت سے رقیبوں کی فنا ہوتی ہے(۶)

═══xxx═══

اننپتی سہائے

ولادت ۱۶/ جولائی ۱۹۲۸ء اور وفات ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ آپ کے والد بابو بلاقی چند پرساد نے پٹنہ کے مضافات سے نقل مکانی کر کے آرا میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ سہائے جی آرا سول کورٹ میں سرشتہ دار تھے۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا مگر کلام نہیں ملتا (۷)۔

═══xxx═══
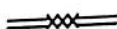
انور، جوگا سنگھ

جوگا سنگھ انورؔ دورِ حاضر کے افسانہ نویس اور ایک خوش فکر اور خوش گلو شاعر ہیں۔ ان کی شاعری مشاعروں میں ایک سماں باندھ دیتی ہے اور لوگ ان کی ساحرانہ آواز میں کھو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر منظر حسین نے ان کی غزلیہ شاعری پر حال ہی میں ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے جو روزنامہ فاروقی تنظیم، رانچی کی ۱۵/ نومبر ۲۰۰۸ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''جوگا سنگھ انورؔ کا شمار ان فنکاروں میں ہوتا ہے جو اپنی تخلیق کے حوالے سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری ''گفتگو بہ زنان کردن'' تک محدود نہیں بلکہ فکر و اسلوب کا حسین امتزاج پیش کرتی ہیں، جن میں عمیق

تجربہ اور مشاہدے کی روشنی پھوٹتی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں ندرت فکر بھی ہے اور ندرت احساس بھی۔ اپنے دوست ہربھجن سنگھ رہبؔر کی تحریک پر شاعری کی طرف مائل ہوئے تو افسانہ نگاری کو خیر باد کہہ دیا۔ مشاعروں کے توسط سے آج جوگا سنگھ انوؔر اپنی شہرت کی بلندیوں پر ملک و بیرون ملک کے سامعین سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ جب اپنے مخصوص ترنم میں غزلیں پڑھتے ہیں تو سننے والوں پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

جوگا سنگھ انوؔر اپنی شاعری میں نہ تو کسی ازم کے قائل رہے اور نہ ہی کسی ادبی تحریک، رجحان یا مسلک کے حامی یا مبلغ۔ وہ انسانیت کے شاعر ہیں۔ توقیر آدم ان کی پہچان ہے۔ ان کی غزلوں میں آدمیت، انسانیت کی گونج ہے۔ دکھے دلوں کی پکار ہے، غم کا وقار ہے، ان کی غزلیہ شاعری احساسات و مشاہدات کی وسعت، فکری سلاست روی، توازن اور صداقت شعاری سے عبارت ہے۔ جوگا سنگھ انوؔر نے جمشید پور کا فساد بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس دور کی خوفناک و غم ناک تصویر اپنے اشعار میں اس طرح اُتارتے ہیں:

آپ نے جلتے مکانوں کی کہانی ہے سنی
میری آنکھوں نے تو جلتے ہوئے انساں دیکھے

یہ اگنی کنڈ یہ انساں کی بلی اور یہ لہو
یہ کس نے شہر کو پوجا ہے دیوتا کی طرح

انوؔر زندگی کے سفاک اور ظالم لمحوں اور کڑوی سچائیوں سے آنکھیں نہیں چراتے بلکہ اسے بیان کر دینے ہی میں ذہنی سکون

حاصل کرتے ہیں۔ ان کے تعلق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ ہمارے ماحول کی زوال آمادگی پر صرف احساس زیاں ہی پیدا کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ ہمارے ذہن و دل کو جھنجھوڑتے بھی ہیں۔

خود کو طوفان سے محفوظ سمجھنے والو
میں نے ساحل سے بھی اٹھتے ہوئے طوفاں دیکھے

اپنے گھر میں روشنی کی جب ضرورت ہو کبھی
اپنے ہمسائے کے گھر مت شعلہ باری کیجیے

لہو سے فصل اگانے کا شوق اچھا ہے
مگر زمین کو اپنا لہو پلانا تھا

دوستو پھر تو بلا تفریق کتنے گھر جلے
آگ کا مذہب سزا سب کو برابر دے گیا

محسوس کیا جا سکتا ہے کہ جوگا سنگھ انوؔر کی شاعری میں فکر و احساس کی ایک دنیا آباد ہے۔ چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جو عصری سچائی کے طنزیہ اظہار پر مبنی ہے:

دور وہ آیا ہے قاتل کی سزا کوئی نہیں
ہر سزا اس کے لیے جس کی خطا کوئی نہیں

گھروں کی راکھ سے آتا پتا چل کے پوچھیں
یہیں کہیں پہ ہمارا غریب خانہ تھا

وقت نے انورؔ بدل ڈالا مذاقِ دوستی
پھول دیتا تھا جو کبھی ہاتھ پتھر دے گیا

یہ تمام اشعار جوگا سنگھ انورؔ کی زندگی بھر کے تجربات و مشاہدات کا عطیہ ہیں جس کو انھوں نے بڑے فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ انورؔ کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسے حادثوں پر چیختے چلاتے نہیں بلکہ جھیل میں پڑی ہوئی کنکری جیسا ارتعاش پیدا کرتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے اشکوں سے اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرتے ہیں:

چپکے چپکے اپنے گھر میں آہ و زاری کیجیے
ہو سکے تو اپنے غم کی پردہ داری کیجیے

اس کو دعائیں دیتے ہیں تلوؤں کے آبلے
جس نے ہماری راہ میں کانٹے بچھائے ہیں (۸)
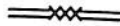
بابو بندؔ باسنی سہائے

بدرؔ آروی کے شاگرد تھے۔ ایک شعر یہ ہے:

کس طرح سے مانوں میں نصیحت تری ناصح
قابو میں نہیں دل ہے خدا کی قسم اپنا (۹)
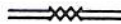
بسملؔ سیوانی

بابو پنڈت بندیشری دت شُکل متخلص بہ بسملؔ محلّہ شُکل ٹولی سیوان میں رہتے

تھے اور وکالت کرتے تھے۔ اردو شاعری میں ان کی گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے سانپ کی ردیف میں جو غزل کہی ہے اس سے ان کی مشکل پسند طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تین چار غزلیں 'سخنوران سارن' میں ملتی ہیں۔ ان غزلوں کا سرسری مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ روایتی شاعر تھے اور شعر گوئی پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

سیاہ زلف نہیں نیلگوں نقاب میں سانپ
چھپے ہیں دہشتِ طاؤس سے سحاب میں سانپ

ڈسا ہے کیا دلِ سوزاں کو تیرے گیسو نے
گیا ہے دانت لگا کر جلے کباب میں سانپ

نہ ان حسینوں کے جوڑے ہیں سر پہ کاکل کے
یہ حلقہ مار کے بیٹھے ہیں پیچ و تاب میں سانپ

جو مار زلف ابھی سے کمر سے آ لپٹے
تو ایڑیوں کی نہ لے لیں خبر شباب میں سانپ

دہانِ زلف کا مارا بچا نہیں ہرگز
ان اژدہوں کے مقابل ہیں کس حساب میں سانپ

خیال گیسوئے جاناں بندھا ہے کچھ ایسا
کہ دیکھتا ہوں میں راتوں کو روز خواب میں سانپ

جو دیکھے گیسوؤں کو ہم نے تر پسینے میں
یہ شک ہوا ہیں نہائے ہوئے گلاب میں سانپ

کسی کے زلف پریشاں کا ہوں وہ سودائی
گلے لگاتا ہوں لے لے کے اضطراب میں سانپ

نہیں ہے زلف سے کالوں کو نسبت اے بسمؔل
لکھا کرے کوئی شاعر تو کیا کتاب میں سانپ (۱۰)

═══

بشؔر، بی۔ڈی۔مہتا

واثؔق دیوروی نے رسالہ خیابان میں ان کا یہ شعر نقل کیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ اور حال معلوم نہیں ہو سکا۔

نہ جلتی شاخ گل تو آشیانہ اور بن جاتا
چھڑایا گردش گردوں نے صحن گلستاں ہم سے (۱۱)

═══
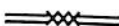
بنارسؔی لال، منشی

موضع اختیار پور، آرا کے ایک گاؤں کے باشندہ تھے۔ 'ادیب القواعد' کے مصنف۔ یہ ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۹ء میں ۲۳۴ صفحات میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے ہم عصروں میں خدا بخش خاں (بانیِ خدا بخش لائبریری، پٹنہ)، امداد امام اثؔر، بدؔر آروی وغیرہ تھے۔ منشی جی آرا میں وکیل تھے۔ ان کے بیٹے بابو شنکر دیال فتنؔہ بھی شاعر تھے۔

نمونۂ کلام:

ستائش کے قابل وہ ذات ہے مگر منہ سے چھوٹا بڑی بات ہے
مناسب نہیں دست و پا مارنا یہاں جیت ہمت کا ہے ہارنا

ختم کر کے جب رکھا میں نے قلم　　تو کانوں میں آئی صدا دم بہ دم
جو پڑھے گا اس کو ہو گا شاد کام　　اور مصنف کا بھی ہوگا خوب نام (۱۲)
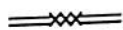
بہآر، اکھوری شیونندن پرساد

قوم کے کائستھ تھے۔ ارول اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ شاگرد داغ دہلوی۔
نمونۂ کلام:

فائدہ خاک جمع زر میں نہیں　　کچھ نہیں خیر اگر بشر میں نہیں (۱۳)
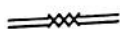
بہآر، بابو شیو ناتھ پرساد

گیا کے رہنے والے تھے۔ اودھ کشور کشتہ، گیاوی کے دوستوں میں تھے اور ان ہی سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے لیکن سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کے سبب شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ ایک شعر بطور نمونۂ کلام یہ ہے:

رہے گا ہمدموں میں جب تک ہمارے دم میں دم باقی
نہیں چھوٹے گا اک دم دامنِ ہندوستاں ہم سے (۱۴)
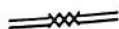
بیر، مہابیر پنڈت

ادریس ایچ. ای. اسکول بتیا (چمپارن) میں ہیڈ مولوی تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

دیتی ہے مجھ کو قدرت صانع کا وہ پتہ

جو شے بنائی ہے میرے پروردگار نے (۱۵)

تقریباً ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء تک بقید حیات تھے۔ طالب علمی کے زمانے کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

حسرت قیس حزیں عشوۂ لیلا میں ہوں
عاشق جلوۂ معشوق سراپا میں ہوں

وائے تقدیر کہ اک دن نہ خبر لی اس نے
چارسو خلق میں جس کے لیے رسوا میں ہوں

آج یا کل مرے قابو سے نکل جائے گا
خوب حال دل وحشی کا شناسا ہوں
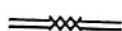
پارسا، وید نندن سہائے

بابو راجندر پرساد کے فرزند تھے۔ ولادت ۱۹۲۹ء آرا میں ہوئی۔ تعلیم بھی آرا میں مکمل کی۔ ۱۹۸۷ء میں ڈالٹین گنج سے ملازمت سے سبکدوش ہو کر آرا آ گئے۔ دوران تعلیم شعر و سخن، ڈراما اور افسانہ نویسی سے دلچسپی رہی۔ اردو شاعری میں قتیل داناپوری سے اصلاح لیتے تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے :

کلی میں مسکراہٹ ہے بلا کی ہوا اکھڑی نظر آئی صبا کی
نقاب یار نے مجھ کو اُبھارا مری ضد بڑھ گئی جوں جوں حیا کی
خدا کا نام لے کر بادہ نوشی زباں کتنی ہے میٹھی پارسا کی (۱۶)
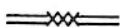
پانڈے رامیشوری پرساد، عرف چھوٹےؔ

پانڈے رامیشوری پرساد، عرف چھوٹے کی پیدائش ۲۵ / اکتوبر ۱۹۳۸ء کو موضع گمہر یا ضلع سیوان میں ہوئی۔ بی.اے.آنرس (ہندی) ایل.ایل.بی.کرنے کے بعد اپنے والد پانڈے مہیشوری پرساد کے ساتھ سیوان کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے اور آج کل سینئر ایڈوکیٹ اور جج لوک عدالت ہیں۔ شاعری کا آغاز ۱۹۶۷ء سے کیا۔ اردو شاعری میں سیوان کے استاد شاعر جناب قمرؔ سیوانی سے اصلاح سخن لیتے ہیں۔ ان کا قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے لوگ انھیں چھوٹے بابو وکیل کہنے لگے اور اس طرح یہ چھوٹے بابو وکیل سے کافی مشہور ہیں اور اسی لحاظ سے شاعری میں بھی اپنا تخلص چھوٹےؔ رکھ لیا۔

انھوں نے تقریباً ایک سو سات مشاعروں میں شرکت فرمائی۔ اردو غزلوں کا مجموعہ ''پہلا آدمی''۔ دس شاعروں پر مشتمل ایک کتاب ہندی میں 'امر پالی' ہے۔ اخبار نویسی کا شوق دامن گیر ہوا تو ٹائمس آف انڈیا، انڈین نیشن (انگریزی)، نو بھارت ٹائمس جیسے مشہور اخبارات سے منسلک ہو گئے۔ چالیس برسوں تک آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن میں بھی خدمات انجام دیں۔ لٹریری ڈیلی گیٹ (مندوبین) کی حیثیت سے بیرونی ممالک کا دورہ کیا جس میں خاص طور پر یورپی ممالک کا دورہ شامل ہے۔ امریکہ سے واپسی کے بعد ایک کتاب انگریزی میں "A Birds Eye View" شائع ہوئی۔ روس سے لوٹنے کے بعد ایک کتاب ہندی میں ''روس : جیسا میں نے دیکھا'' شائع ہوئی۔ فلموں سے بھی تعلق رہا۔ کئی ایک ہندی اور بھوجپوری فلموں میں بحیثیت کیریکٹر آرٹسٹ کام کیا۔

آپ کی شاعری جہاں رومانی اور عشقیہ ہوا کرتی ہے وہیں کہیں کہیں آپ کے شعروں میں طنز کا پہلو بھی نکل آیا کرتا ہے۔ ایک واقعہ پیش آیا جس سے آپ نے

منقبت بھی لکھنی شروع کر دی۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ شادی کے سلسلے میں لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انجمن اسلامیہ دار الشفا میں سرسید ڈے کے موقع پر ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ آپ کی ملاقات شاعر حفیظؔ بلیاوی سے ہو گئی۔ آپ ان کے ساتھ مشاعرہ میں گئے۔ وہیں لکھنؤ کے ایک شاعر جناب ماتھرؔ لکھنوی کے منقبت کے اس شعر سے کافی متاثر ہوئے۔

کہہ کے بدعت بھی مسلماں جب الگ ہو جائیں گے
ہو کے ہندو ہم اٹھائیں گے علَم عباس کا
(ماتھرؔ لکھنوی)

اس کے بعد منقبت کے اشعار کہنے لگے جس میں محمدؐ و آل محمدؐ سے ان کی عقیدت اور احترام کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ امام حسن علیہ السلام کی مدح میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک ہندو کر رہا ہے انتظار اپنی جگہ
بہرِ دیدارِ حسنؑ ہے بے قرار اپنی جگہ
دار پر چڑھ کر بھی میں یہ کہنے کو تیار ہوں
نور ہے پشتِ رسالتؐ پر سوار اپنی جگہ
بڑھ گئی ہے حیثیت میری حسنؑ کی بزم میں
قد میں اونچا آج ہے یہ خاکسار اپنی جگہ

ایک ہندو کا دل مائلِ نور ہے — آج مولا کو کچھ اور منظور ہے
ایک ہندو کے دل میں ہیں مولا علی — باغِ جنت میں یہ بات مشہور ہے
میکدہ ایسا تم کو ملے گا کہاں — بن پئے ہر بشر آج مخمور ہے

زاہد کی برہمن کی نہ تو پارسا کی ہے
اس دور کو تلاش علی مرتضٰی کی ہے
جس نے لہو سے سینچا شریعت کا گلستاں
توقیر ہر نگاہ میں اُس باوفا کی ہے
جبریل آ کے جھولا جھلاتے ہیں صبح و شام
یہ شام صرف سبطِ شہِ انبیا کی ہے

اس طرح آپ منقبت کے اشعار میں برگزیدہ شخصیات سے عقیدت و احترام کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔

آپ کی عشقیہ شاعری عشق میں غوطہ لگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

عشق جیتا ہے شرافت کا تقاضہ بن کر — عشق مرتا ہے محبت کی حمایت کے لیے
عشق زنجیر پہنتا ہے بنائے سجدہ — عشق جذبات میں ڈھلتا ہے عبادت کے لیے
عشق اللہ کی رحمت کا نتیجہ یارو — عشق آیت ہے محبت کی تلاوت کے لیے
جذبۂ عشق کی تاریخ بتاتی ہے مجھے — عشق اُترا تھا تو فرہاد کی شہرت کے لیے

عشقیہ شاعری کے کچھ اور نمونے ملاحظہ ہوں:

جس طرف تیرا در نہیں ہوتا — میرا رُخ بھی اُدھر نہیں ہوتا
اشک پلکوں میں چھپائے رکھیے — اشک کا اور گھر نہیں ہوتا
قہقہوں سے یہ اشک بہتر ہے — ان سے دھوکے کا ڈر نہیں ہوتا

آپ کی غزلوں میں ایک عجیب طرح کا بانکپن بھی ملتا ہے:

نہ مثلِ گل نہ گلِ تر کے بانکپن کی طرح
میری غزل تو ہے نازک ترے بدن کی طرح

آپ کی غزلوں کے اشعار میں طنز کا پہلو بھی نکل آتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

وہ شخص دن میں دکھاتا ہے راہ لوگوں کو

وہ شخص رات نظر آیا راہِ زن کی طرح

دل کو قرار آئے گا رسوائیوں کے بعد ——— نہ تشنگی کے پہلے نہ رعنائیوں کے بعد
تیرا بھی قتل ہوگا ترے بھائیوں کے بعد ——— یوں قاتلوں کو کرتا رہا تو اگر معاف

چھوٹے بابو کی غزلوں میں قومی یک جہتی اور آپسی اتحاد و یگانگت کے موضوع پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔

ان کو ملی ہے صبح، مجھے دو پہر ملے ——— سورج کسی بھی قوم کی جاگیر تو نہیں
بھگوان اور خدا سے سبھی بے خبر ملے ——— مذہب پہ لڑ رہے تھے کئی قافلے مگر

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:

آپ کی نظر کرم سے موم پتھر ہو گیا
اس طرح مجھ پر رحم کی میں بے گھر ہو گیا
میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا فرشتوں کی طرح
پھر بھی جو جملہ کہا جملہ وہ منتر ہو گیا

آپ کی شاعری میں جہاں ایک طرف غمِ یار ہے وہیں غمِ روزگار کا بھی ذکر ملتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہو:

غمِ حیات میں جو غم ہمارے ساتھ رہے ہیں
وہ غم قدیم ہیں لیکن سہیلیوں کی طرح
وہ خوش ہیں ساری خدائی خرید کر لیکن
ہمارا ٹوٹا ہوا گھر حویلیوں کی طرح

کچھ اور متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے، جن سے شاعر کے مختلف افکار کی بخوبی ترجمانی ہوتی ہے:

آسماں کا آپ کیوں احسان لیتے ہیں جناب
میرے اشکوں میں ستاروں کا نظارا کیجیے

ہم سفر دشمن اگر ہے آپ کا تو کیا ہوا
مڑ کے پیچھے ہم سفر کو بھی پکارا کیجیے

ہاتھ میں جس شخص کے پتھر پڑا دیکھا گیا
آج اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ دیکھا گیا
مطمئن وہ اُس طرف ہیں، مطمئن میں اس طرف
حادثوں کے شہر میں یہ فائدہ دیکھا گیا

آپ نے تضمین کے بھی اچھے شعر کہے ہیں :

چھوٹے میں دورِ نو میں وفا کا ہوں آئینہ
''مجھ سے جو ملنے آئے وہ دل کھول کر ملے''

چھوٹے، لوگوں کی بات مت مانو
''میں نے چاہا مگر نہیں ہوتا''

چھوٹے میاں نے شمع جلائی ہے خون سے
''اس کا کمال دیکھنا پُروائیوں کے بعد''
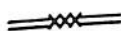
پرویز، ساکیت رنجن

۷/ فروری ۱۹۶۹ء کو موضع پلوئی ٹولے، عنایت پور ضلع سارن میں پیدا ہوئے۔ ایم. بی. اے. کی تعلیم حاصل کی۔ شعر و شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ دکش نرنجن شمبھو سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ ہندی اور اردو کے اخبارات میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ انھوں نے حمد، نعت، منقبت کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی خوبصورت

اشعار کہے ہیں۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

حمد

جو روحِ کائنات دمِ آفتاب ہے　　اس کا کہاں جواب ہے وہ لاجواب ہے
جملہ رسولؐ ہے تو وہ پوری کتاب ہے　　ہر فرد ایک حرف ہے ہر قوم ایک لفظ

نعت

کیا ہو بیاں جہاں میں فضیلت رسولؐ کی
خلقت ہے خود جہاں کی بدولت رسولؐ کی
کرتی ہیں ان کی مدح مرے دل کی دھڑکنیں
میں کیا کروں زبان سے مدحت رسولؐ کی

اس لفظ سے بڑھ کر کوئی تحریر نہیں ہے　　بے مثل ہے دنیا میں فقط لفظِ محمدؐ
یہ لفظ کسی قوم کی جاگیر نہیں ہے　　ہر قوم ہے جاگیر اسی لفظ کے پیارے

منقبت

جب تلک قائم رہے گا آئینہ اِتہاس کا
تذکرہ ہوتا رہے گا حضرتِ عباسؓ کا
کیوں نہ ہو محسوس وہ ہر دور میں ہر قوم میں
بن چکا ہو شخص جو مرکز ہر اک احساس کا

قطعہ

کرتے ہیں پہلے حال ہمارا خراب وہ
پھر ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیا حال چال ہے

دنگا کرا کے آپ نے کرسی سنبھال لی
کیا خوب بھائی واہ غضب ہے کمال ہے

ایسا طوفاں ہے کہ دریا پار کر سکتے نہیں
اور اس عالم میں کشتی سے اُتر سکتے نہیں
بے بسی کیسی ہے ہم ساحل ہیں تو دریا ہو تم
ہم تو چل سکتے نہیں اور تم ٹھہر سکتے نہیں

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

درمیاں ہم دونوں کے شیشے کی اک دیوار ہے
دیکھ تو سکتے ہیں لیکن بات کر سکتے نہیں

سوچیں گے ہم نہ آپ کے بارے میں آج سے
ہم سوچتے ہیں روز یہی بات کیا کہیں
ساکیتؔ آپ غیر کی باتوں کو چھوڑیے
اپنوں نے جو دیے ہیں وہ صدمات کیا کہیں
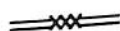
تنگؔ عنایت پوری

سنیل کمار تنگؔ عنایت پوری ۲؍ جنوری ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئے۔ بی. اے. تک تعلیم حاصل کی۔ سیوان کے ادبی اور شعری ماحول میں رہنے کے سبب شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ یوں اگر دیکھا جائے تو شاعری انھیں وراثت میں ملی ہے۔ ان کے دادا شامؔ عنایت پوری اردو اور فارسی کے کہنہ مشق اور صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔

ابتدا میں جوہرؔ سیوانی کی صحبت میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔

سیوان میں ''بزم انور'' کی ماہانہ شعری نشستوں اور سیوان کے مضافات گوپال پور، حسین گنج، حسن پورہ، رگھو ناتھ پور اور دیگر مقامات میں ہونے والی محفلوں اور شعری نشستوں میں شعرائے سیوان کے ہمراہ شرکت نے ان کے شوق کو ہوا دی۔ کبھی سنجیدہ شاعری کرتے تھے اور طرحی کلام پیش کرتے تھے مگر اب باضابطہ طنز و مزاح ہی سے خود کو وابستہ کر رکھا ہے اور بطور مزاحیہ شاعر ملک اور بیرون ممالک کے چھوٹے بڑے بے شمار مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔

بقول اُن کے ۱۹۷۲ء سے شاعری کا باضابطہ آغاز کیا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ ابتدا میں قمرؔ سیوانی اور کوثرؔ سیوانی سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور وہ بتاتے ہیں کہ جوہرؔ سیوانی کے ساتھ ملک کے معروف طنزیہ و مزاحیہ شاعر جناب رضا نقوی واہیؔ مرحوم کی خدمت میں حاضری دی اور بقول ان کے بعض کلام پر اصلاح بھی لی۔ تنگؔ عنایت پوری کے بغیر کوئی مشاعرہ سونا ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی شاعری اگرچہ بظاہر لوگوں کو لوٹ پوٹ کر دیتی ہے لیکن اس میں بھی کوئی نہ کوئی پیغام پوشیدہ ہوتا ہے۔ ابھی ان کا کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے لیکن 'رینگتے قہقہے' کے نام سے مجموعہ تیار ضرور ہے۔ راقم السطور کی شادی کے موقع پر تنگ نے ایک سہرا لکھا تھا جو طنز و مزاح میں ہے۔ وہ ہندی اور انگریزی کے عام الفاظ کو بڑی خوبی سے اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

خواتین کے رزرویشن کے موضوع پر کہا ہے:

جب عورتیں بھی جیت کے سنسد میں آئیں گی
اور قومی اتحاد کا منظر دکھائیں گی
ہر قوم کو یہ پیار کا لیسن پڑھائیں گی
مذہب کی راجنیتی کے چھکے چھڑائیں گی

مسلم کی عید گاہ نہ ہندو کے دھام پر
ہوگی جو بحث بھی تو محبت کے نام پر

اِک بھیڑ سی لگے گی سیاسی دکان پر
آئیں گی ہاتھ جوڑے حسینہ مکان پر
مانگیں گی ووٹ اپنے چناوی نشان پر
بجلی گرا کے جائیں گی اک اک جوان پر

بندوق چپ رہے گی سیاسی تناؤ میں
گولی چلے گی آنکھ سے اب کے چناؤ میں

میری شادی پر تنگ عنایت پوری نے جو مزاحیہ سہرا لکھا تھا اسے بھی تفنن طبع کے لیے نقل کر رہا ہوں:

سہرے کا کرشمہ

دُلھن اِک عدد گھر میں لاتا ہے سہرا — اِکہرے کو دُہرا بناتا ہے سہرا
کنواروں کو دولھا بناتا ہے سہرا — مرادوں کی ڈولی سجاتا ہے سہرا
ہنساتا ہے شادی کے دن گدگدا کر — مگر بعد شادی رُلاتا ہے سہرا
مرا تجربہ ہے کہ بَر کو پھنسا کر — سدا دن میں تارا دکھاتا ہے سہرا
تصور کے تاریک کمرے میں آکر — چراغِ محبت جلاتا ہے سہرا
جو سہرے کی خوشبو پہ ہوتا ہے مائل — اسے مثلِ بندر نچاتا ہے سہرا
حسیں آرزوؤں کے مکتب میں لاکر — سلیقہ وفا کا سکھاتا ہے سہرا
یہ طاقت کا دشمن ہے طاقت کا دشمن — خلیفہ کو مریل بناتا ہے سہرا

اسے کچھ چٹا کر چھڑاتا ہوں پیچھا
مجھے تنگ جب بھی [illegible] ہے سہرا

نــوٹ : ''گلہائے رنگارنگ'' (سہروں کا مجموعہ) بہ تقریب شادی خانہ آبادی اسرار احمد بہ ہمراہ انجم نسرین، ۷/مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۱۰

═══xxx═══

جمنا پرساد، جھن جھن والا

آپ کی پیدائش ۲۹/اگست ۱۹۰۸ء میں گدری بازار موتیہاری میں ہوئی اور وفات ۲۳/جنوری ۱۹۶۸ء میں پائی۔ کسب فیض مولانا عترت حسین عشرتؔ ہرگانوی سے حاصل تھا۔ تخلص جمناؔ رکھتے تھے۔

نمونۂ کلام :

شبنم یہ کہہ رہی تھی بادِ صبا سے رات
دنیا میں ہوں میں رات بھر آنسو بہانے کے لیے

جل جل کے شمع سا پگھل پہلے تو اس کے عشق میں
پروانہ ہوں گے آپ وہ جلنے جلانے کے لیے (۱۷)

═══xxx═══
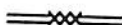
جودتؔ، منشی جدوبیر سہائے

والد کا نام منشی بنواری لال صوفیؔ قصبہ مانپور (گیا) کے رہنے والے تھے۔ قوم کے کائستھ تھے۔ حشرؔ بیتھوی، مشفقؔ اور کوثرؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں ۵۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام یہ ہیں :

طور پر برق جو چمکی ہوئے موسیٰ بیہوش
جلوۂ رُخ کے سوا اس میں کوئی راز بھی تھا

کج ادائی نے تمھاری یہ اثر دکھلا دیا
پڑ گئے زلف سیہ فام میں خم آپ سے آپ (۱۸)

ان کی چند غزلیں مختلف گلدستوں میں شائع ہوئی تھیں جن میں سے ایک غزل یہ ہے:

گیا ہے نالۂ دل آسماں تک — اب آگے دیکھیے پہنچے کہاں تک
وفور ضبط سے راز محبت — نہ آیا گوشۂ دل سے زباں تک
کچھ ایسی بے نشاں راہِ عدم ہے — نہیں ملتا نشانِ رفتگاں تک
رہی ثابت قدم سر دے کے آخر — کٹا دی شمع نے اپنی زباں تک
پھنکا ہوں آتش فرقت سے ایسا — ہوئی ہیں راکھ جل کر ہڈیاں تک
جلایا اس طرح سوزِ نہاں نے — نہیں نکلا مرے منہ سے دھواں تک

ملا اس کا پتا دل ہی میں جودت
جسے ڈھونڈا زمیں سے آسماں تک (۱۹)
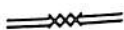
جوشؔ مظفرپوری، بابو مہیشور پرساد

تاریخ ولادت و وفات نہیں ملتی لیکن ۱۹۱۴ء تک بقید حیات تھے اور تقریباً ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ حفیظؔ جونپوری سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ایک مختصر دیوان 'بہارِ جوش' طبع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

یہی ہے حال تو آئے گا دشمنوں کو ترس
عجب نہیں کہ سفارش کرے عدو میری (۲۰)
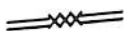
جوؔہر، بابو رادھے لال

جوؔہر، منشی بجرنگ سہائے صنوبؔر اور بابو پیریا لال فطرؔتی کے رشتہ داروں میں تھے۔ سنہ پیدائش تقریباً ۱۸۸۴ء ہے۔ میر باقؔر عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا (۲۱)۔
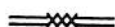
جوگؔی، جوگیندر پرساد

جوگیندر پرساد تخلص جوگؔی، موضع بھٹکن ضلع سیوان کے رہنے والے۔ ایم. اے.، بی. ایل. تک تعلیم حاصل کی اور وکالت کرتے تھے۔ شاعری میں مولوی مکی صاحب چھپروی کے شاگرد تھے۔ درج ذیل نظم بطور نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

زمینِ ہند کو جنت نشاں ہم کو بنانا ہے
وطن کی آبرو مِل جُل کے ہم سب کو بڑھانا ہے

اَہنسا، شانتی کا پاٹھ پھر ہم کو پڑھانا ہے
جو گایا گیت تھا باپو نے وہ ہم کو بھی گانا ہے

جفا و ظلم و استبداد کی بنیاد ڈھانا ہے
وطن کی آبرو کے واسطے گولی بھی کھانا ہے

محبت، انس و الفت کا دیا ہر سو جلانا ہے
ہر اک ذرّے کو رشکِ کہکشاں ہم کو بنانا ہے

چمن کو لوٹ کر برباد کر ڈالا تھا ظالم نے
اسی اُجڑے ہوئے گلشن کو پھر ہم کو سجانا ہے

غریبوں کی شکستہ جھونپڑی میں اے خرد والو
چراغ انس و الفت بالیقیں تم کو جلانا ہے

وہ رستہ جس پہ چلنے کو کہا تھا سب سے گاندھی نے
اسی رستہ پہ چلنے کے لیے سب کو بلانا ہے

جلا کر خاک کر دے جو عمارت ظلم و عدواں کی
وہی شعلہ، وہی آتش یقیناً اب جلانا ہے

جگا دے جو وطن کے باسیوں کو خواب غفلت سے
تجھے بھی اب سے اے جوگیؔ اسی نغمے کو گانا ہے(۲۲)

مذکورہ بالا نظم سے جوگیؔ کی حب الوطنی اور اپنے ملک کے سلسلے میں گہری محبت وعقیدت کا پتا چلتا ہے۔
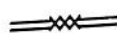
چمنؔ، کامتا پرساد

کامتا پرساد متخلص بہ چمنؔ کولیدھر (آرا) کے رہنے والے تھے۔ بدرؔ آروی کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اس مہ روشن کے رُخ پہ کاکل و بال ہے
شامت نصیب دل پہ ہمارے زوال ہے

مضمون خال یار میں تِل بھر جگہ نہیں
کیا نکتہ ور نکالیں گے اس میں جو دال ہے

یاں تک خموش ہے مرے سوز و گداز پر

دیکھو تو شمع چپ ہے زباں اس کی لال ہے

ملتا ہے حسیں خاک میں مطلب نہ شفا سے
کیا خاک شفا ہوگی اطبا کی دوا سے
ہے ڈاک لگی ابلقِ ایام کی دیکھو
کیا عمر رواں جاتی ہے کیا تیز ہوا سے
ظاہر میں ترے اور ہیں باطن میں ہے کچھ اور
یہ رنگ اُڑایا ہے اجی تم نے حیا سے (۲۳)
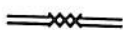
حسرتؔ، رادھا رمن بہاری

ولد گھور باری رام۔ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے اور ۳۰/ جنوری ۱۹۷۹ء کو وفات پائی۔ چوگائیں (آرا) کے رہنے والے تھے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے اور نصرتؔ آروی کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ — ساقی بھی جب تھا اپنا، اپنا شراب خانہ
میں رندِ دُرد کش تھا مستی میں جھومتا تھا — لہرا رہا تھا بادل ساون کا تھا مہینہ
وہ بے بسی کا عالم مت پوچھ مجھ سے ہمدم — آنسو ٹپک رہے تھے جلتا تھا آشیانہ

ڈر ہے کہ گھٹا پھر کہیں اس طرح نہ برسے
چاہے بھی نکلنا تو نہ نکلے کوئی گھر سے

دبا لیا ہے مرا دل کسی نے مٹھی میں — کفِ حنائی میں رنگینیٔ حنا نہ ہوئی (۲۴)

حیرتؔ فرخ آبادی، جیوتی پرساد مشر

آپ کی پیدائش ۸؍فروری ۱۹۳۰ء کو ضلع بہرائچ میں ہوئی۔ سینٹ اینڈریوز کالج گورکھ پور میں نامی نقاد و استاد محترم مجنوں گورکھ پوری سے اردو اور انگریزی ادب پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ ۱۹۶۰ء سے رانچی میں (متحدہ بہار) کے انگریزی کے استاد رہے۔ ۱۹۹۰ء میں سبکدوش ہوئے اور اب رانچی میں ہی مستقل طور سے سکونت (کھوسلہ ہاؤس، گراؤنڈ فلور، نارتھ آفس پاڑہ روڈ، ڈورنڈا، رانچی) اختیار کر لی ہے۔ اب بھی کوچنگ سنٹروں میں درس و تدریس کا کام انجام دے رہے ہیں۔

آپ کے والد مرحوم متھرا پرساد مشر الٰہ آباد کی تحصیل پھولپور کے ایک گاؤں میں ایک برہمن زمیندار شری بندیشوری پرساد مشر کے خاندان میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ تقریباً چھ سات سال کی عمر میں وہ اپنے والد کے ساتھ ماگھ میلہ گھومنے کے لیے گئے۔ اس میلے کی بھیڑ میں وہ اپنے والد سے بچھڑ گئے۔ عیسائی مشنری کے کچھ لوگ انھیں لے جا کر اپنے پاس رکھا اور ان کی تعلیم و تربیت عیسائی مذہب کے طور طریقے پر ہوئی تھی۔ حیرتؔ صاحب کے نانا جان ایک پٹھان خاندان کے فرد تھے۔ بعد میں انھوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لی۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہندو، مسلم اور عیسائی تین اہم مذاہب سے تعلق نے حیرتؔ صاحب کو زیادہ فراخ دل اور روادار بنا دیا ہے اور وہ کسی بھی تنگ نگاہی سے دور ہو کر تمام انسانی مذاہب اور مسلکوں کے انسانوں سے یکساں طور پر محبت کرنے لگے۔ خود لکھتے ہیں:

> ''جب بھی کوئی ہندو، مسلمان یا عیسائی مارا جاتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرا ہی خون بہہ رہا ہے''۔

سچائی یہ ہے کہ ایک تخلیق کار کی دردمندی اور حقیقی مذہب یہی انسان دوستی اور غیر مشروط رواداری ہے۔

شاعری انھیں ورثے میں ملی۔ ان کے والد (مرحوم) نامیؔ تخلص کرتے تھے۔
سب سے پہلی نظم ''غریب طالب علم'' آٹھویں جماعت کے اپنے ایک کلاس فیلو محمد آفاق کی زندگی سے متاثر ہو کر کہی تھی۔

۱۹۵۲ء سے با قاعدہ شعر کہہ رہے ہیں۔ جب یہ بی.اے. میں پڑھ رہے تھے ان کا پہلا شعری مجموعہ کلام ''نوائے ساز دل'' ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے پر اُتر پردیش اکادمی نے ۱۹۸۸ء میں انعام سے نوازا۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''حسِ التماس'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ٦ سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ چونکہ ''حسِ التماس'' میں کچھ منتخب کلام نوائے ساز دل کا بھی شامل ہے، جس پر محترم پروفیسر وہاب اشرفی صاحب نے کچھ جملے تقریظ کے لکھے ہیں۔

حیرت صاحب کی زبان اور شعری اسلوب کا ایک نمایاں وصف سادہ و سلیس طرز بیان ہے۔

یوں تو ساری فضا کھلی سی ہے — یہ ہوا کیوں گھٹی گھٹی سی ہے
اب کوئی بھی وہاں نہیں رہتا — ساری بستی میں خامشی سی ہے

ان دنوں جی دُکھا سا رہتا ہے — ہر گھڑی دل بجھا سا رہتا ہے
چارسُو نفرتوں کی بارش ہے — زخم دل کا ہرا سا رہتا ہے

غم میں تیرے نہ کبھی ہم نے کمی پائی ہے — دل جو اُمڈا تو ان آنکھوں میں نمی آئی ہے
شعر کہنے کا سلیقہ نہیں آتا حیرت — آہ جو دل سے اٹھی لب پہ چلی آئی ہے

جن کو انسان سمجھتے تے وہ پتھر نکلے — آستینوں میں مرے یاروں کے خنجر نکلے

ایسا نہیں کہ وہ صرف حالات کہ نوحہ گر ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں طنز ہے اور سوال بھی جو ایک حساس شاعر کا فطری جذبہ ہے۔ ایک ایسے شاعر کا جس نے قومی

وحدت اور تہذیبی یکجہتی کی گود میں پرورش پائی ہو انسان کی انسانیت ہی اور اس کی محنت اور کرشمہ سازی کے منظر بھی جا بجا دیکھے ہوں۔

یوں تو شریانوں میں ہر لحظہ سِسکتا ہے لہو
چوٹ لگتی ہے تو زخموں سے ٹپکتا ہے لہو

حد سے بڑھ جاتی ہے جب تن کی جلن من کی گھٹن
صورتِ شعر میں تب جا کے لہکتا ہے لہو

حیرت صاحب بلا شبہ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وہ شعر میں الفاظ کو برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

حضور عارض زیبا گلاب کیا ہوگا — جو لاجواب ہو اس کا جواب کیا ہوگا
نگاہِ شوق سے چھپنا محال ہے تیرا — مچل گئی تو یہ تیرا نقاب کیا ہوگا
تمھارے حسن کا چرچا ہے عشق کے دم سے — رہا نہ عشق تو حسن و شباب کیا ہوگا
گناہ کم ہوں تو توبہ کی فکر کی جائے — جو بے حساب ہوں ان کا حساب کیا ہوگا
گناہگاروں سے رحمت کی شان ہی باقی — نہ ہوں گناہ تو روزِ حساب کیا ہوگا
اماں ملی نہ ترے در پہ، نہ ہی دنیا میں — جہاں میں ہم سا بھی خانہ خراب کیا ہوگا
یہاں جلا ہوں وہاں بھی جلایا جاؤں گا — اب اس سے بڑھ کے بھلا اور عذاب کیا ہوگا

جسے شکست ملی ہو نصیب میں حیرتؔ
وہ بدنصیب بھلا کامیاب کیا ہوگا
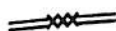
خلشؔ گیاوی، جگیشر پرساد

اردو زبان و ادب کے لیے خلشؔ ندروی گیاوی کی خدمات ناقابل فراموش

ہیں۔ وہ شاعر، ادیب، مدیر اور سیاستداں تھے۔ سریر کابری اور بسمل سہنساروی کے معاصر تھے۔ گیا سے ایک ماہوار اور باتصویر رسالہ ۱۹۱۳ء میں 'بزم سخن' کے نام سے جاری کیا، جس کے مدیر بھی خلشؔ گیاوی تھے۔ ۱۹۱۶ء کے دو شمارے (جلد ۳، شمارہ ۲، ۳) خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہیں۔ یہ رسالہ منشی نول کشور پریس لکھنؤ میں چھپتا تھا اور دفتر بزم سخن ندرہ ضلع گیا سے جاری کیا جاتا تھا۔

خلشؔ گیاوی نے گیا سے ایک ماہنامہ 'تاج' بھی جاری کیا تھا، جو پورے ہندستان میں مقبول تھا۔ اس میں ملک کے معروف شعرا اور قلم کاروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اردو کی ادبی صحافت میں خاص کر بہار کے ادبی رسالوں کی تاریخ میں رسالہ تاج کی خدمات اہمیت کی حامل ہیں۔

خلشؔ گیاوی شاعر بھی بہت اچھے تھے۔ تاج کے صفحات میں ان کا کلام بھی ملتا ہے۔ خواجہ عشرتؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ خلشؔ کی نمایاں خدمات میں گیا میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کروانا ہے۔ انھوں نے ایسے کئی بڑے مشاعرے کروائے۔ ایک مشاعرے کی صدارت علامہ سیمابؔ اکبرآبادی نے کی تھی اور جو خطبۂ صدارت انھوں نے دیا تھا وہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اردو سبھا گیا کے سکریٹری بھی تھے، جس کا مقصد اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے اس کے شعری اور نثری سرمایے کا تحفظ کرنا اور طرحی مشاعرے منعقد کرنا تھا۔

خلشؔ نے 'فروغ بزم معروف بہ تذکرۂ شعرائے صوبہ بہار' کے نام سے شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جو ۱۹۱۸ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں عظیم آباد کے سوا دیگر اضلاع کے شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کچھ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

کیا ویراں بہار داغ دل نے خانۂ تن کو
جلا ڈالا انھیں آتش فشاں پھولوں نے گلشن کو

حقیقت صاف آتی ہے نظر اس میں زمانے کی

دلِ شفاف میرا آئینہ ہے دوست دشمن کو
وہی گل اب سر تربت گریباں چاک کرتا ہے
ہنسی میں جو اُڑا دیتا تھا میری آہ وشیون کو
رُلائے گی لہو میری اُمیدوں کو ہنسی تیری
لگائے گی یہ بجلی آگ اک دن میرے خرمن کو
کیا کیا فیصلہ تیغ نظر نے درمیاں ہو کر
چلو ستے چھٹے مدت سے بھاری سر تھا گردن کو
اسی کی سادگی نے اے خلش بے موت مارا ہے
جوانی کی دعا دیتے ہیں ہم اُنکے لڑکپن کو (۲۵)

اس پہ کیوں مرتے ہیں کیوں اُسکی تمنا دل میں ہے
بات کچھ کھلتی نہیں جو خنجر قاتل میں ہے
دور ساغر کی طرح گردش ہے اہل بزم کو
آپ سے باہر ہے وہ جو آپ کی محفل میں ہے
دیکھیے آکر یہاں رنگین پھولوں کی بہار
اک شگفتہ باغ ہے جو داغ میرے دل میں ہے
ناصح مشفق نصیحت اپنی رہنے دیجیے
عشق کا جوہر ازل سے میرے آب وگل میں ہے
ایک ہی صورت کو دو کر کے دکھا دیتا ہے یہ
جوہر آئینہ پنہاں خنجر قاتل میں ہے
غیر ہنستا ہے اُدھر مجھ کو لب جاں دیکھ کر
میں اِدھر خوش ہوں کہ کشتی دامنِ ساحل میں ہے

ہوش کس کو ہے جو لے اٹھ کر قیامت کی خبر
دم بخود ہر اک عدم کی پہلی ہی منزل میں ہے

حشر میں ہم داد چاہیں اور ان کے سامنے
رعب اتنا ہے کہ منہ کی منہ میں دل کی دل میں ہے

قبر میں آتے ہی روشن ہو گیا محشر کا حال
آخری منزل کا منظر پہلی ہی منزل میں ہے

چھپ نہیں سکتا چھپانے سے غبارِ آئینہ
صاف چہرے سے عیاں ہے جو تمھارے دل میں ہے

مل کے وہ کھینچتا ہے اور کھینچ کے ملتا ہے خلش
بڑھ کے قاتل سے یہ خوبی خنجر قاتل میں ہے (۲۶)

نام یوں عاشق صادق ترے کر جاتے ہیں
موت آنے نہیں پاتی ہے کہ مر جاتے ہیں

میری تقدیر سے اچھے ہیں تمھارے گیسو
جب بگڑتے ہیں سنوارے سے سنور جاتے ہیں

رات بھر رو رو کے ہم کو بھی رُلاتی ہے عبث
ہم سے جلتی ہے تو اے شمع سحر جاتے ہیں

ابھی کمسن ہیں وہ سن کر مرے نالے شب ہجر
سہم جاتے ہیں، جھجک جاتے ہیں ڈر جاتے ہیں

یہ کہاں تاب کہ دیکھیں رُخِ روشن تیرا
مرنے والے ترے انداز پہ مر جاتے ہیں

اٹھ کے کعبہ سے تو ہم آئے ہیں بت خانے کو
دیکھیں اب بت جو اٹھاتے ہیں کدھر جاتے ہیں

توڑ کر عہد وفا جاتے ہو تم غیر کے گھر
ہم بھی اب نزع میں دم توڑ کے مر جاتے ہیں
یاد رہ جاتی ہے بے مہریِ احباب خلشؔ
دن مصیبت کے گزرنے کو گزر جاتے ہیں (۲۷)

آ گئی دل میں کدورت خاک اب دیدار ہو
شکل کیا آئے نظر جب بیچ میں دیوار ہو
نشہ میں راحت ملے ہر جام پر انکار ہو
لطف دونا ہو جو ساقی اس طرح تکرار ہو
جرم بے حد اور بھی ہیں اک گنہ یہ بھی سہی
میری ہی گردن پر خون حسرت اغیار ہو
ساقی مہوش کی آنکھوں کا اشارہ ہے یہی
آج میخانے میں آئے جو کوئی ہشیار ہو
قول یہ سچ ہے کہ دل ہی دوست بھی دشمن بھی ہے
یہ نہ ہو تو کس لیے معشوق سے تکرار ہو
اپنے مشتاقوں کا پھر شوقِ شہادت دیکھنا
میان سے باہر تو چشم لطف کی تلوار ہو
کیوں نہ تیغ رشک سے کٹ کٹ کے حاسد ہوں ہلال
بدر جب بڑھ کر خلشؔ یہ مجلس اشعار ہو (۲۸)

کیا کہوں لوگ تری زلف کو کیا کہتے ہیں
مختصر یہ ہے کہ ہر اک کالی بلا کہتے ہیں
اے خلشؔ یار نے بھیجا ہے جوابِ نامہ

کیوں وہاں آؤں جسے لوگ گیا کہتے ہیں(۲۹)

ضبط کے ساتھ تڑپ بھی دلِ ناشاد رہے
تازہ تصنیف رہے کچھ نئی ایجاد رہے
ہو کے پابند علائق نہ ہوئے ہم پابند
پا بہ گل ہو کے خلشؔ سرو سا آزاد رہے(۳۰)

پھونک دیں دشمن کے گھر بھی یہ تو کچھ مشکل نہیں
دودِ شمع بزم میرے نالہ ہائے دل نہیں
اس کی الفت کا نتیجہ کچھ نہ پوچھو اے خلشؔ
یہ ہوا حاصل مجھے ابتک کہ کچھ حاصل نہیں(۳۱)

خلشؔ ندروی کے کلام کا سرسری مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی شاعری روایتی شاعری ہے جس میں عشق و عاشقی کے مختلف پہلوؤں کی صاف اور سیدھی سادی ترجمانی ہوتی ہے۔ ان کا کلام پاکیزگی کا بھی حامل ہے۔ ان کے بارے میں فصیح الدین بلخی نے لکھا ہے:

''بیسویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں اردو شاعری اور ادب کی ترقی میں انھوں نے بہت کافی حصہ لیا۔ سیاسی تحریکوں میں بھی انھوں نے عملی حصہ لیا''(۳۲)۔
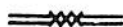
دردؔ، لالہ امرت لال

موضع لودی پور ضلع گیا کے کائستھ زمیندار تھے۔ خلشؔ گیاوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں ۴۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ہر گل میں ہر شجر میں ہر ایک خار میں
جلوہ ترا ہی ہے چمنِ روزگار میں (۳۳)

امرت لال دردؔ لودی پوری کی یہ غزل ماہنامہ تاج گیا اپریل ۱۹۲۲ء، ص ۱۳۳ پر شائع ہوئی تھی۔ یہ غزل اردو سبھا گیا کی طرح میں ہے:

کیوں نہ مر جاؤں جو پہلو میں ہو دلدار نہیں
زندگی تلخ ہے جس کا ہو کوئی یار نہیں
کہہ دے اے بادِ صبا اس گلِ تر سے جا کر
تیرے بیمار میں اب زیست کا آزار نہیں
ہو کے آزاد بھی اے دردؔ نہیں ہے آزاد
دامِ گیسو میں جو ظالم کے گرفتار نہیں

نزع میں چھوڑ کے کیوں غیر کے گھر جاتے ہیں
ہم کدھر جاتے ہیں اور آپ کدھر جاتے ہیں
تم دکھاؤ نہ مجھے ابروئے خمدار کی باڑھ
مرنے والے کہیں شمشیر سے ڈر جاتے ہیں
بحر الفت نے مجھے جب سے ڈبویا اے دردؔ
چاہ کا نام بھی سنتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں (۳۴)

شکریہ شاعران کامل کا — جم گیا آج رنگ محفل کا
منہ پہ کہتا ہے حال دشمن و دوست — صاف اتنا ہے آئینہ دل کا
شادیانے خوشی کے بجتے ہیں — آج نکلا ہے حوصلہ دل کا
ضبط کی آہ مرحبا اے عشق — پردہ اٹھ جاتا ورنہ محمل کا

بزم میں سیکڑوں حسیں ہیں درد
کوئی پرساں نہیں مرے دل کا(۳۵)

دردؔ نے یہ غزل آل انڈیا مشاعرہ گیا (منعقدہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء) کو پڑھی تھی۔ اس مشاعرے کی صدارت علامہ سیمابؔ اکبرآبادی نے کی تھی:

ترک الفت اپنی فطرت میں ہے گو داخل نہیں
کیا کروں ناصح مگر اب مانتا ہے دل نہیں

میں تجھے نوشیرواں بھی کہہ دوں کچھ حاصل نہیں
ساری دنیا کہتی ہے تجھ سا کوئی قاتل نہیں

بزم افسردہ نہیں کیوں کر ہو گاندھی کے بغیر
روشنی کیا ہو جہاں شمع سر محفل نہیں

دل یہ کہتا ہے کہ سینہ سے لگا لوں یار کو
عقل کہتی ہے کہ اس عزت کے وہ قابل نہیں

صبر سے اے دردؔ اپنا کام کرتے جایئے
اس سے بہتر اور کوئی کوشش کامل نہیں
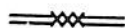
دہاتیؔ، بابو ہری ہر پرساد چنچل عرف لال بابو

۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام بابو ہری کشن داس چنچل محلّہ لہری ٹولہ گیا میں رہتے تھے۔ اگروال پریس کے مالک تھے۔ اردو شعر و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ طبعاً بذلہ سنج اور ہنس مکھ انسان تھے۔ مزاحیہ شاعری کرتے تھے۔ 'بہار پنچ' نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا۔ اس کے بعد 'خواہ مخواہ' کے نام سے ایک اخبار

نکالا۔ ہندی میں 'رنگیلا' نام سے ایک اخبار نکالا۔ بقول خواجہ عشرت لکھنوی ''کلام میں جدت اور تازگی ہے'' (۳۶)۔ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

بستانِ دہر میں یہ گلستاں ہے کس لیے   نغمہ سرائے مرغ خوش الحاں ہے کس لیے
جب زندگی ہی اپنی دہاتی ہے بے ثبات   عیش و نشاط کا سرو ساماں ہے کس لیے

دنیا کا انقلاب دکھانے کے واسطے   محتاج مجھ کو کر دیا دانے کے واسطے
راحت جو بعد رنج دہاتی ہوئی نصیب   اچھا سبق ملا یہ زمانے کے واسطے

شگن میں فیس میں نذرانے میں اور محنتانے میں
مؤکل کی حجامت بنتی ہے مختار خانے میں

چوک کے کوٹھے جو ہیں سب امیروں کے لیے
کوٹھری نیچے کی ہے، ہم بے نوا کے واسطے

گولٹا شادی نے رشتہ کر دیا تیتر بٹیر   نصف سرج کا رہا، آدھا رہا ہمشیر کا

خوب بن پڑتی ہے ان کے گھر یہ خدمتگار کی
چوک پر ڈیوٹی بجاتے ہیں جو چوکیدار کی
وصل کی شب رنگ اس کمسن کا یوں فق ہو گیا
جیسے کمھلائے کوئی کچی کلی کچنار کی

رام بابو، انوج سہائے

پٹنہ عدالت میں وکیل تھے۔ منشی رام پرکاش لال کے فرزند۔ موضع کلیان پور

(سابق ضلع شاہ آباد) کے رہنے والے تھے۔ ولادت ۱۹۲۸ء سمبت ہے۔ ''جادوگر جوگی'' نامی ناول کے مصنف ہیں جو چھپ چکا ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

مست ہو کر پھر رہی ہے آج اترائی ہوئی
کوچۂ جاناں سے ہے شاید صبا آئی ہوئی(۳۷)

رام سروپ چودھری

ان کے والد کا نام بابو رام شیدؔا ہے۔ چودھری صاحب کا تعلق سیتاپور سے تھا۔ چودھری صاحب اپریل ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک وہ مونگیر میں قیام پذیر رہے وہاں کے شعری اور ادبی ماحول نے انھیں متاثر کیا۔ شاعر تو وہ تھے ہی، اہل مونگیر کے ذوق شعر و ادب کو دیکھتے ہوئے چودھری صاحب بھی وہاں کی بزم ادب کے رُکن بن گئے۔ لکھتے ہیں:

''اپریل ۱۹۶۵ء میں مونگیر (بہار) جانا ہوا وہاں ۱۹۷۱ء تک قیام رہا۔ مشق سخن کے لیے وہاں کا ماحول راس آیا۔ ماہانہ و نیز دیگر خصوصی نشستوں میں متواتر شرکت کا موقع ملا۔ سیتاپور میں جناب الحاج نواب سید ابراہیم حسین صاحب ملاؔ مرحوم اور جناب مولانا سید یوسف مسیح آغا اشہر لکھنوی مرحوم اور دیگر ہم عصروں نے کافی نوازا۔ ''بزم نصیری'' کا صدر منتخب کر کے عزت افزائی کی۔ راسم الحروف کے پہنچنے کے کچھ دنوں پیشتر مونگیر میں بھی ''بزم احباب'' وجود میں آچکی تھی جس کے خصوصی کارکن جناب ڈاکٹر سید منصور حسن صاحب صدیقی، جناب سید شفیع الزماں صاحب مشہدی، ڈپٹی مجسٹریٹ جناب

پروفیسر مہدی اور جناب محمد تقی صاحب شاعر تھے۔ جناب مشہدی صاحب ایک ہونہار نوعمر شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ نہایت خلیق اور مہذب انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اس بزم کے روح رواں تھے۔ وہاں کے احباب نے اس ہیچ مداں کی کافی عزت افزائی کی۔ ان کا شکر گزار ہوں"۔

چودھری صاحب کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کو اردو شاعری کی مختلف اصناف میں شعر کہنے میں مہارت حاصل تھی۔ غزل، نظم اور قطعہ و رباعی کی صورت میں ان کا کلام دستیاب ہے۔ وہ قیس مہونوی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ چودھری صاحب کی شاعری میں حب الوطنی اور وطن دوستی کے ساتھ انسانی اور اخلاقی جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ احساس کی گہرائی اور فکر کی بلندی وہ نمایاں عناصر ہیں جو ان کے یہاں پہلی نظر میں قارئین کو متوجہ کر سکتے ہیں۔ نمونۂ کلام کے طور پر چودھری صاحب کی وہ نظم نقل کی جا رہی ہے جو انھوں نے ۱۱ر مارچ ۱۹۷۴ء کو مظفر پور میں لکھی تھی۔

شہر مونگیر

اے مونگیر خوش ادا اے ملک کے شہر کہن
نقش ہے اب تک دلوں پر تیرا اوج اور بانکپن

گردشِ دوراں نے گو تجھ کو ملایا خاک میں
زخم ہیں پھر بھی نمایاں سینۂ صد چاک میں

تیرے قلعہ کے کھنڈر ہیں تیری عظمت کے نشاں
مرتبت ہوتی ہے تیری ذرّہ ذرّہ سے عیاں

ہیں جلو میں تیرے رودِ گنگ کی موجیں رواں
آسمانوں سے اُتر آئی ہو جیسے کہکشاں

پاسبانی تیری کرتی ہے پہاڑی پیر کی
ہے فضاؤں میں صدا اب تک تری توقیر کی

یادگار میر قاسم کی نشانی ہے تو ہی
عہد ماضی کی بس اک غم کی کہانی ہے تو ہی

مژدہ اے شہر کہن تو پھر جواں ہونے کو ہے
''اردو فورم'' بے زبانی کی صدا ہونے کو ہے(۳۸)
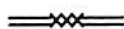
رائے، رائے گوپال کرشن

محلہ میتن گھاٹ پٹنہ سیٹی کے رہنے والے تھے۔ سنہ ولادت ۱۸۹۷ء ہے۔ انگریزی و فارسی اور اردو میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ بچپن سے اردو شاعری کی طرف طبیعت مائل تھی۔ پہلے میر باقؔر عظیم آبادی پھر وحیؔد الہ آبادی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے لیکن باقاعدہ شاگردی اختیار نہیں کی۔ انگریزی اور ہندی میں ایک کتاب Moments with Raj Gopal Krishna کے نام سے ۱۹۵۷ء میں شائع کی۔ اس میں مختلف شعرا کا کلام اور انگریزی ترجمہ شامل کرنے کے ساتھ اپنا کلام بھی دیوناگری میں درج کیا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

۱۹۳۴ء کا بھونچال

جب یک ہزار و نُہ صد و سی و چہار پر — سنہ عیسوی کا پہنچا، ہوا ہند منتشر
دو شنبہ پندرہ جنوری کو وقت سہ پہر — صورت میں زلزلے کا ہوا قہر ایشور
یوں مبتلا تو اس میں ہے ہندوستان بھر — لیکن بہار ہو گیا مغضوب خاص کر
پٹنہ خدا گواہ کہ پٹنہ نہیں رہا — اس قہر ایزدی کا ہوا اس پہ وہ اثر

ترہت، مونگیر میں تو ہوئے صاف گھر کے گھر ایسے مٹے کے مٹ گیا مٹنے کے آگے ڈر
ریلیں، سڑک خراب ہوئیں پُل بھی جابجا پانی کی کل بھی بجلی ٹیلی فون تار گھر
کیا لہلہاتے کھیت تہہ آب ہو گئے پھیلی تمام ریت ہوئے خشک چاہ تر
بچے نثار جن پہ ہوں دُرہائے آبدار بن پانی مر گئے نہ ملا پانی بوند بھر

سن کر فسانہ رائےؔ کا جس کا نہ دل پھٹے
سینے میں اس کے دل نہیں ہے پارۂ حجر(۳۹)

اس نظم میں ۱۹۳۴ء میں بہار میں آنے والے تباہ کن زلزلے سے ہونے والی تباہی و بربادی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس سے شاعر کے اندرونی کرب کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ رائے صاحب نے غزل، نظم اور قطعہ گوئی کے ذریعہ اپنے تجربات و مشاہدات کی بخوبی عکاسی کی ہے۔

رُسواؔ، ستیش چندر

ستیش چندر رُسوا یکم فروری ۱۹۳۲ء کو اُناؤ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد آنجہانی گوبند پرساد اور والدہ نرائن دئی تھیں۔ ملازمت کے دوران موتیہاری تشریف لائے اور انجینئر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد مستقل طور پر چھوٹا بریارپور، موتیہاری (مشرقی چمپارن) میں مقیم ہوگئے۔ آپ نے ۱۹۵۸ء سے شعر کہنا شروع کیا اور پروفیسر محمد اسمٰعیل وحشی سے کسب فیض کیا۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

غزل

رہِ شوق میں پھر سے جانے لگے ہیں ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے ہیں

جنھیں ووٹ دے کر کے بھیجا گیا تھا　　وہی جا کے مطلب سدھانے لگے ہیں
نہیں دور ہوتے بھرم دیکھ کر بھی　　ترے آستانے پہ آنے لگے ہیں
اسے بھول جانے کی کوشش میں ہی ہم　　کسی اور سے دل لگانے لگے ہیں
کہاں چھوڑ کر جائیں رُسوا کو بولو
اسی شہر میں دن بِتانے لگے ہیں(۴۰)

رندھیرؔ، راکیش رنجن

۱۰ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو موضع پلوئی، ٹولے عنایت پور ضلع سارن میں پیدا ہوئے۔ بی. ایس سی. (آنرس)، بی. ایڈ. اور ایل. ایل. بی. تک تعلیم پائی۔ ۱۹۸۲ء سے شاعری شروع کی ہے۔ گھریلو ماحول میں شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انھوں نے بھی نعت و منقبت اور غزلیں کہی ہیں۔ ان کے کلام سے یہ نعت و منقبت ملاحظہ کریں:

جس دن سے ایک ہندو پہ چشمِ حضور ہے　　احساس کے شوالے میں رحمت کا نور ہے
جس کے دل و دماغ میں کوئی فتور ہے　　وہ شخص بزم حسن عقیدت سے دور ہے
کعبے کے ساتھ آج ہے کاشی بھی بزم میں　　یہ قومی اتحاد کا منظر ضرور ہے
جس کو دکھائی دیتا نہیں نور حیدری　　وہ شخص آنکھ والا نہیں ہے وہ سور ہے
یہ ایکتا کے چاند کی آمد کا ہے اثر　　مندر میں مسجدوں کی طرح آج نور ہے
کہتا ہے ہر فرشتہ کہ حکم خدا ہے یہ　　حیدر سے جو ہے دور خدا سے وہ دور ہے
شنکر نے دی ہے پاربتی جی کو یہ خبر　　کعبے میں آج نور خدا کا ظہور ہے
میری ہتھیلی دیکھ کے مولا نے یہ کہا
رندھیرؔ تیرے بھاگیہ میں جنت کا نور ہے

قطعہ

خدا کے نور کا جلوہ دکھائی دیتا ہے　　زمیں سے عرش کا زینہ دکھائی دیتا ہے
نظر کے سامنے ہے آج گنبد خضرا　　مجھے یہاں سے مدینہ دکھائی دیتا ہے
اللہ کا پیام سنایا رسول نے　　وحدت کا راز سب کو بتایا رسول نے
آئینۂ خلوص دکھایا رسول نے　　ماحول دین حق کا بنایا رسول نے

رندھیر کی زبان سے سن کر یہ نعت پاک
اس کو غلام اپنا بنایا رسول نے

غزل

جس کی نگاہ میں یہ مکمل جہان ہے
وہ شخص اس جہان میں کتنا مہان ہے
کس حد کا اس نے بوجھ اٹھایا تھا سوچیے
پتھر پہ اس کے پاؤں کا گہرا نشان ہے
الفاظ میرے سب کی زباں پر ہیں آج تک
وہ کاٹ کے زبان مری بے زبان ہے
صدیوں سے جو کھڑے تھے وہ کاٹے گئے درخت
آئے گی دھوپ اب جہاں ان کا مکان ہے
ہم نے بھی ٹھان لی ہے پہنچنے کی چاند تک
حالانکہ اس سفر کی یہ پہلی اُڑان ہے
تجھ کو نصیب ہو جو بلندی تو یہ بھی دیکھ
چوٹی کے چاروں اور غضب کی ڈھلان ہے

رکھنا سنبھال کر یہ وراثت تمام عمر
رندھیر تیرے گھر کی یہ اردو زبان ہے

رنگیں، بابو بشن نرائن لال ماتھر

بابو ہر نرائن لال ماتھر کے بیٹے۔ ۱۹۰۶ء میں پٹنہ میں ولادت ہوئی۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں بہت باصلاحیت تھے۔ شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی میں معلّم تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

رنگین شفق سے جیب جو ہے جوئبار کا
''دامن لٹک رہا ہے عروسِ بہار کا''

شہرہ ہے آمد آمد فصلِ بہار کا
ہر نخل منتظر ہے نئے برگ و بار کا

آئی بہار چار طرف آگ سی لگی
ہر لالہ زار آئینہ ہے شعلہ زار کا

ہے دام صد اُمید میں بلبل کا دل اسیر
آیا ہے گلستاں میں زمانہ بہار کا

محفل میں فیض ساقئ عادل کا عام ہے
پیمانہ بے شراب ہے کس بادہ خوار کا

سارے جہاں میں آپ جو مشہور آج ہیں
احساں کہیں نہ یہ ہو اسی خاکسار کا

دنیائے رنگ و بو میں بسر زندگی ہوئی
میں آشنا ہوں راز خزاں و بہار کا

شاخِ مراد جس کی نہ پھولے پھلے کبھی
وہ نخل غم ہوں میں چمنِ روزگار کا

کانٹے جو پاسباں ہیں تو گل مطمئن نہ ہوں
گلچیں کے دل میں خوف نہیں نوکِ خار کا

دن کو سکوں نصیب نہ شب کو نصیب چین
رنگیں نہ پوچھ حال دلِ سوگوار کا (۴۱)
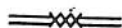
رنگینؔ، منشی چھیدن لال

محلّہ مراد پور، گیا میں رہتے تھے۔ نواب امداد امام اثرؔ کے ملازم تھے۔ باذوق اور صاحب طبع سلیم تھے۔ کتب بینی اور شعر و سخن ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اردو اور فارسی میں خاص مہارت تھی۔ اودھ کشتہؔ گیاوی کے شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

جو ہیں اچھی صورت پہ مر جانے والے　　وہ ہیں نام دنیا میں کر جانے والے

میں نے قسمت کی جو شکایت کی　　اس میں شکوہ تو آپ کا نہ ہوا

یوں قیامت تک رہے دنیا سلامت مجھ کو کیا
میری دنیا ساتھ ہی میرے فنا ہو جائے گی (۴۲)
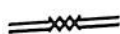
روشنؔ، پردیپ کمار

اورنگ آباد (بہار) سے تعلق رکھنے والے شاعر و ادیب پردیپ کمار روشنؔ اپنی تخلیقات کے سبب جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے غزلیں اور نظمیں کہی ہیں۔ ان کے کلام میں ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔ ان کا لب و لہجہ بھی جدید ہے۔ خیالات بڑے توانا ہیں۔ شاعری کے بارے میں ان کا نظریہ بڑا خوبصورت ہے۔ کہتے ہیں:

باندھنا احساس کو لفظوں میں کچھ آساں نہیں
دوستو! یہ شاعری قطرہ بھی ہے ساگر بھی ہے

ان کی شاعری کا مقصد کچھ عجیب و غریب ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

نہ بھوک شہرت کی ہے اور نہ خواہش احترام کی

کہ مقصدِ شاعری ہے روشنؔ ہر ایک کو بے نقاب کرنا

روشنؔ ایک زندہ دل شاعر ہیں۔ ان کے کلام سے بھی ان کی زندہ دلی روشن ومنور ہے۔ بچپن سے نکل کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی روشنؔ کو شعر و شاعری کا چسکا لگ گیا۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ڈراما نویسی بھی کی ہے اور کچھ ڈراموں میں اداکاری بھی۔ لیکن ابھی بھی وہ یکسوئی سے کسی ایک کے ہو نہیں پائے ہیں۔ گردشِ ایام کی طرح وہ بھی گردش میں ہیں لیکن انھیں اس کی قطعی پروا نہیں۔

میں ہوں گردشوں میں گھرا تو کیا مرے واسطے نہ دعا کرو
یہ الم خدا کی ہی دین ہے مرے حال پر نہ ہنسا کرو

ان کے چند اشعار اور پیش کیے جاتے ہیں:

جو نہیں ہو تم وہی کیوں ہو رہے ہو   غیر کو پانے میں خود کو کھو رہے ہو

احساسِ درد جاگ اٹھا خواب سو گئے   بھرنے کو زخم تھا وہ نشتر چبھو گئے

کارواں نگل رہے ہیں راستے   ساتھ ساتھ چل رہے ہیں راستے

مجھے یہ جان کر حیرت نہیں ہے   تمھارے سر پہ کوئی چھت نہیں ہے

خوف کی زد میں ہیں ساری بستیاں   دیکھتی ہیں ہر مکاں کو بجلیاں

کیا خبر تھی اسطرح کا دور بھی آجائے گا
بھیڑ میں انساں کے جب انساں کو ڈھونڈا جائے گا

مجھے یہ دور یزیدوں کا دور لگتا ہے   کوئی ہے بھوک کا مارا تو کوئی پیاسا ہے
ہمارے پاس تو قرآں، گرنتھ، گیتا ہے   فقط ہی نام کے ہندو ہیں، سکھ ہیں مسلم ہیں

ہر ایک شخص کا مذہب ہے قیمتی روشنؔ ہے اور بات کہ ایمان مفت بکتا ہے

═══xxx═══
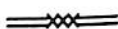
زیباؔ، لالہ رام جی

گیا میں رہتے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے آس پاس شاعری کی۔ ایک شعر بطور نمونۂ کلام یہ ہے:

کس کی الفت کی ہے کشش دل میں
سوزِ غم سے جو ہے تپش دل میں (۴۳)

═══xxx═══

سبھاشؔ چند یادو

والد کا نام رام چیز یادو۔ تاریخ ولادت یکم جولائی ۱۹۵۵ء۔ ہندی ادبیات میں ایم.اے. تک تعلیم حاصل کی۔ ہائی اسکول کے زمانے سے ہی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ ہندی اور بھوجپوری زبانوں میں ان کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۶۷ء سے آکاشوانی گورکھ پور سے ان کا کلام نشر ہو رہا ہے اور ۱۹۹۵ء سے آکاشوانی پٹنہ سے بھی ان کا کلام نشر ہونے لگا ہے۔ کئی کتابوں کی مجلس ادارت و ترتیب میں بھی شریک رہے ہیں۔ ان دنوں داروغہ پرساد رائے کالج سیوان کے پرنسپل ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی خوب کہی ہیں۔ ان کی غزلوں میں اردو اور ہندی کا سنگم دیکھتے ہی بنتا ہے۔ ان کے شاعرانہ کلام میں موضوعات کا تنوع بھی ملتا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

گاؤں والے بھی اہل نظر ہو گئے — گاؤں جتنے بھی تھے اب نگر ہو گئے
اب نہ پنگھٹ نہ گھونگھٹ نہ شرم و حیا — ختم رشتے، رواجوں کے ڈر ہو گئے

شہر میں اپنے ہم دربدر ہو گئے
اے سبھاش اس کی چشمِ عنایت ہے یہ

اشک میں ڈوبی ہوئی وہ زندگانی دے گیا
مٹ نہیں سکتا کبھی ایسی نشانی دے گیا

لے گیا سب کچھ مرا بس دے گیا تنہائیاں
بیقراری دل کو دی آنکھوں میں پانی دے گیا

جھوٹ کا پیکر تھا وہ جھوٹی کہانی دے گیا
چاند تارے اور سورج سب زبانی دے گیا

وہ ادنیٰ بات میں بھی اک فسانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
جو شاعر ہیں محبت کا ترانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

تڑپ کر بھوک سے مرتے پرندے کو نہیں دیکھا
بھروسہ خود پہ کرتے ہیں وہ دانہ ڈھونڈ لیتے ہیں

کیسے کیسے یہ دن گزرتے ہیں　　روز جیتے ہیں روز مرتے ہیں
زندگی کیا ہے درد و غم کے سوا　　پھر بھی مرنے سے لوگ ڈرتے ہیں
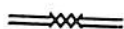
سشیل، رادھیکا رنجن

موضع پلوئی، ٹوے عنایت پور ضلع سارن میں ۱۵ر جنوری ۱۹۵۹ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم بی.اے. تک حاصل کی۔ اپنے بڑے بھائی دکش نرنجن شمبھو سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ ان کا کلام اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا ہے اور یہ مشاعروں میں شرکت بھی کرتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

آگ لگنے کی خبر تجھ کو بھی ہے مجھ کو بھی ہے
جل کے مر جانے کا ڈر تجھ کو بھی ہے مجھ کو بھی ہے

مجھ سے شبنم نے کہا دن میں کبھی رونا نہیں
کیوں کہ رونا رات بھر تجھ کو بھی ہے مجھ کو بھی ہے

اک نئی دلہن سے پروانے نے جا کر یہ کہا
جل کے مرنے کا ہنر تجھ کو بھی ہے مجھ کو بھی ہے

مان سمّان شان کیا لو گے ؟ تم مرا امتحان کیا لو گے ؟
یہ محلّہ ہی ہے شہیدوں کا بچہ بوڑھا جوان کیا لو گے ؟

آپ خاموش رہ نہیں پائے اور ہم کچھ بھی کہہ نہیں پائے

سنگی، بابو بیج ناتھ سہائے

تقریباً ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ منشی درگا سہائے کے فرزند۔ قوم کائستھ۔ موضع خواص پور (گیا) کے زمیندار و مختار۔ اردو اور انگریزی زبانوں میں مہارت تھی۔ خلشؔ گیاوی کے شاگرد تھے۔

ایک شعر ملتا ہے:

بدی کرتے ہیں کیوں اہل جہاں نیکی کے بدلے
سبب اس کا یہ ہے شاید زمانہ اب خراب آیا (۴۴)

شاؔم عنایت پوری، بابو شیام کشور سری واستو

بابو شیام کشور سری واستو شاؔم ۱۸/اکتوبر ۱۸۸۸ء میں موضع عنایت پور تھانہ مانجھی ضلع سارن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں حاصل کی اور میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی.اے. کیا اور یونیورسٹی اسکول آف لا الہ آباد سے ایل.ایل.بی. اور کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم.اے. کیا۔ ان کے والد کا نام بابو اُدِت نرائن تھا جو میرٹھ میں انسپکٹر آف پولس تھے۔ الہ آباد کے قیام کے دوران اکبؔر الہ آبادی جیسے معروف شاعر کی صحبت رہی۔ وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ شام عنایت پوری کا کلام سنتے اور انھیں مشورے بھی دیتے تھے۔ انھوں نے سیوان میں وکالت شروع کی اور اسی پیشہ سے وابستہ رہے۔ سخنوران سارن میں ان کی دو غزلیں اور ایک نظم ملتی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ شاؔم عنایت پوری کو شاعری میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

غزلیں

یہ لے جاں ہے اپنی، یہ ایمان اپنا — چڑھاوے کا تیرے ہے سامان اپنا

محبت، محبت، محبت، محبت — یہ مصرع ہے گویا کہ دیوان اپنا

یونہی خوں کروگے تو دھبّوں سے خوں کے — بچاؤ گے کب تک گریبان اپنا

عوض گل کے بستر پہ آنکھیں بچھیں گی — ذرا ان کو ہونے دو مہمان اپنا

لیے راہ میں منتظر دیر سے ہیں — یہ قسمت کہاں، سر ہو قربان اپنا

دکھا روئے انور کہ ہو صبح محشر — اندھیرا پڑا ہے شبستان اپنا

ہو چاک گریبانِ صبحِ قیامت — اگر چاک کر دوں گریبان اپنا

تھا حصرِ فلک شاؔم بہر حفاظت
مگر دزد نکلا نگہبان اپنا

قیصری فغفوری اپنے گھر کی ویرانی ہوئی
کیسی ساسانی ہوئی، اے عشق، خاقانی ہوئی
جس دلِ بیتاب سے سیماب کو تھا انفعال
تیرے رُخ کے آئینے سے اس کی حیرانی ہوئی
باہمہ خامی نبردِ عشق سے اکھڑے نہ پاؤں
کیا یہ ممکن تھا ؟ مگر تائید ربانی ہوئی
قطرہ ہائے خونِ ناحق کا یہ واں حسنِ اثر
تھی پشیمانی عرق زا، یا دُر افشانی ہوئی
حجت و برہان معصومی رسد از خود ز غیب
چاک دامانی دلیل پاک دامانی ہوئی
سر بہ زانو کیوں ہے پھر اندیشۂ عشرت میں شاؔم
جب مدارِ ہر توقع ہستیٔ فانی ہوئی (۴۵)

شاؔم نے 'نظم غالب' کے عنوان سے جو نو اشعار کی نظم لکھی ہے وہ فارسی زبان میں ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شاعری کی قدرت رکھتے تھے۔ اس نظم کا مقطع اور مطلع ملاحظہ ہو:

اے کہ در جنت مکاں کردی چو بگذشتی زتن
دوستان خویش را بگذاشتی اندر محن
قدر شعر غالبؔ مرحوم روز افزوں کناد
کردگارا ! از دعائے صبح شام مفتتن

ایسا لگتا ہے یہ نظم شاؔم عنایت پوری نے غالبؔ جیسے بلند مرتبہ شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کہی ہو۔

شاؔم عنایت پوری کے چند متفرق اشعار یہ ہیں:

یہ کیسی آخر بہار آئی   کلی کے لب پر ہنسی نہیں ہے

چارہ گر سب مرے ناچار ہوئے جاتے ہیں   اور وہ درپئے آزار ہوئے جاتے ہیں

دورِ خزاں کا ذکر عنادل کے سامنے   فرقت کی شرح عاشق بسمل کے سامنے

دندانہائے اشک کی غافل کو کیا خبر   حاصل ہیں ہیچ سب مرے حاصل کے سامنے

═══××═══

شرؔر، بابو سکھی چند

قمؔر آروی کے شاگرد بعد میں بدؔر آروی سے بھی اصلاح لینے لگے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

کہتے ہیں آئینہ میں وہ شکل اپنی دیکھ کر
کوئی بھی اس جہان میں ہم سا حسیں نہیں

بوسہ جو ہم نے یار سے مانگا شبِ وصال
شرما کے کس ادا سے وہ بولے نہیں نہیں

جس کو نہیں زوال وہ کوئی کمال ہے   اک دن فلک پہ ماہ کو ہونا محال ہے
میں نقد دام دے کے منگا دوں تو ہو حرام   قاضی کو مفت کی جو ملے تو حلال ہے
آنکھوں میں صبح ہو گئی، ہیں راتیں فراق کی   فرقت میں تیرے خواب کا آنا محال ہے

═══××═══
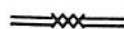
شرؔر سیوانی، پون شرما

تاریخ پیدائش ۸؍ دسمبر ۱۹۵۶ء۔ تعلیم بی۔اے۔ مشورۂ سخن فہیم جوگا پوری

سے کرتے ہیں۔ نوجوان شعرا میں شؔرر سیوانی قابل توجہ اور قابل ذکر دونوں ہیں۔ ان کا کلام جدید لب و لہجہ کا حامل ہے۔ سیوان کے شعرائے کرام کی صحبت سے انھوں نے کافی اکتساب فیض کیا ہے، خاص کر جناب کوثؔر سیوانی، جناب فہیؔم جوگاپوری اور ڈاکٹر ظفر کمالی جیسے شعرا اور نکتہ دان فن نے شؔرر کی شاعرانہ تربیت میں معاونت کی ہے۔ شؔرر نے مقامی اور بیرونی مشاعروں میں شرکت کے ذریعے اپنے فن کو مزید تابدار بنایا ہے۔ سہ ماہی 'ادراک' گوپال پور میں آپ کی غزلیں چھپ چکی ہیں۔

ان کی شاعری میں عصری حسّیت کا مکمل انعکاس ملتا ہے۔ مستقبل میں ان سے کافی اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ فن کی صداقت پورے طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔

کچھ نہ کچھ ہوتی ہے مجبوریٔ انساں ورنہ — کون دنیا میں صداقت کا طرفدار نہیں

سحر ہوتے ہی ظلمت کا سراپا ٹوٹ جاتا ہے
جو سچا، سچ پہ ہو قائم تو جھوٹا ٹوٹ جاتا ہے

شرم آتی ہے ناگنوں کو بھی — آدمی زہر جب اُگلتا ہے

بات بن جائے جو باتوں سے تو اچھا ہے شرر
کیا ضروری ہے کہ تلوار اٹھاؤ یارو

فصلیں ہیں زرد زرد زمیں بھی اُداس ہے
ان غمزدوں کو پھر کہیں ساون رُلا نہ جائے

لب ساحل پہ منظر تشنگی کا — بہت پیاسا سمندر لگ رہا ہے

ان کی شاعری کی مختصر عمر کو دیکھتے ہوئے (آغاز شاعری ۱۹۹۷ء) کہا جاسکتا ہے کہ شؔرر سیوانی نے بہت مختصر سے وقت میں اپنی صلاحیتوں کے سبب اپنی اردو شاعری

کو ایک سمت عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ زیادہ تر غزلیں ہی کہتے ہیں۔

شمبھو، دکش نرنجن سری واستو

۲۲؍اپریل ۱۹۵۲ء کو موضع عنایت پور ضلع سارن میں پیدا ہوئے۔

شمبھو جی عہد طفلی سے ہی شعر و سخن میں طبع آزمائی کرنے لگے تھے کیوں کہ شروع سے ہی گھر کا ماحول ادبی رہا۔ صبح ایک مصرع طرح دے دیا جاتا تھا، جس پر سبھی کو شام میں کچھ نہ کچھ سنانا پڑتا تھا۔ اس طرح گھر میں چھوٹی موٹی نشستیں ہو جایا کرتی تھی۔ جس میں گھر کے بچے بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ اس طرح اردو شاعری کے لیے ان کے خاندان کی جو خدمات ہیں وہ ایک میل کا پتھر ہے کیوں کہ ان کے گھر میں اردو شاعری ۱۹ویں صدی سے ہی ان کے پردادا دیو نارائن دیوؔ کے زمانے سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ان کے دادا شیام کشور سری واستو شامؔ سے ہوتے ہوئے ان کے والد منی شنکر سری واستو اور آپ کے فرزندوں میں دکش نرنجن شمبھوؔ، راجیو رنجن عرف سنیلؔ کمار تنگؔ عنایت پوری، رادھیکا رنجن سوشیلؔ، سدھیر پریہ رنجن، راکیش رنجن رندھیرؔ سے ہوتے ہوئے سب سے چھوٹے بھائی ساکیت رنجن پرویزؔ تک اردو میں شعر گوئی کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔

شمبھو جی چھپرہ کے جس محلے میں رہتے ہیں وہاں اکثر و بیشتر محافل و مجالس ہوا کرتی تھیں اور اس میں مصرعہ طرح بھی دیا جاتا تھا۔ کچھ گھریلو ماحول اور مجالس کی شرکت وصحبت سے اردو میں اچھے شعر کہنے لگے۔ آپ نے منقبت میں علامتی (Symbolic) اشعار بھی کہے ہیں، جس سے آپ کی فنکارانہ صلاحیت اُجاگر ہوتی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

ہم تو کم ظرف ہیں ماتم بھی نہیں کر سکتے

ہم سے بہتر نہیں اے دوست کبوتر نکلا

حضرت عباس علم دار کی شان میں کہتے ہیں :

چڑھ پائے گا نہیں کوئی غدار گھاٹ پر
جب تک رہے گا حق کا طرفدار گھاٹ پر
حقدار جو نہیں تھے وہ سب غرق ہو گئے
سویا ہے اب بھی گھاٹ کا حقدار گھاٹ پر

وہ حضرت عباس علم دار کو کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں سمجھتے، بلکہ کہتے ہیں :

مقید ایک گھر میں چاند کی تنویر ہے کیسے!
علمبردار صرف اک قوم کی جاگیر ہے کیسے!

انسان کے فانی ہونے کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں :

چار کندھوں کے سہارے جا سکا ہے قبر تک
آج میں نے دیکھ لی ہے آدمی کی حیثیت

کچھ غزلیہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں :

ہم زہر پی رہے ہیں مگر بولتے نہیں — ان کو بھی کیا نہیں ہے خبر بولتے نہیں
معلوم نہیں کون سی نفرت کی بات ہے — مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں ادھر بولتے نہیں

ملکی حالات کی عکاسی کچھ اس طرح کی گئی ہے :

نگر نگر جہاں چپ بڑی اُداس رات ہے
یہاں ہر اک زبان چپ بڑی اُداس رات ہے
ہر اک سمت رہزنی فساد اور دشمنی
حدیث چپ پُران چپ بڑی اُداس رات ہے
ہوا ہے جب سے شہر میں فساد کا یہ سلسلہ
ہے سنکھ چپ، اذان چپ بڑی اُداس رات ہے

ان شعروں میں مارکسی نظریہ کی بھی ترجمانی ہوتی ہے :

کیسے کہہ دوں کہ مکاں اور لنگوٹی دے دے
اور مریضوں کو دواؤں کی گوٹی دے دے
کوئی بچہ کہے جس ملک میں روکر ماں سے
پھر نہیں مانگوں گا میں ایک ہی روٹی دے دے

اب تو ہر ظلم کو سانچے میں ڈھلنا ہوگا
ہم کو تو بس اسی ماحول میں پلنا ہوگا
زندگی موم کی مانند اگر کومل ہے
پھر تو اس موم کو اس آگ میں جلنا ہوگا
بن کے فولاد ہر اک حال سے لوہا لے کر
قیدِ آزادی سے اب ہم کو نکلنا ہوگا

یہ شعر انسانیت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

خون ہوتے ہی مچ گئی بھگدڑ   کون دیکھے مرا کہ زندہ ہے
ایک کوّا مرا جٹے کوّے   بہتر انسان سے پرندہ ہے

شمیم، بھگوتی چرن ورما

بھگوتی چرن ورما محلّہ لوہار پٹی، مشرقی چمپارن، ۲۸ ستمبر ۱۹۵۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار چمپارن کے...... گفتار شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ کو طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر و سخن سے شغف تھا۔ آپ مولانا عترت حسین عترت کے شاگردوں میں سے ہیں آپ اردو ہندی ہر دو زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ آپ گوری شنکر مڈل اسکول موتیہاری میں معلم تھے۔ چونکہ وفات کے وقت بچے چھوٹے

تھے، اس لیے سارا کلام ضائع ہو گیا (۴۶)۔

نمونۂ کلام:

مبارک شیخ کو جنت کی حوریں
مرا عشق بتاں ہے اور میں ہوں

ہم کو فرصت ہی کہاں جاتے ہیں میخانے کو
ناصحا چاہو تو آؤ وہیں سمجھانے کو

شمع نے کب کہا کچھ کہیے تو پروانے کو
ایک جذبہ اسے لے آتا ہے جل جانے کو
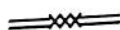
شیام نرائن لال، پروفیسر

پروفیسر شیام نرائن لال کی پیدائش ۲۳ر جولائی ۱۸۹۱ء ہے۔ ۱۹۰۳ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا اور پورے صوبہ میں اوّل آئے، جس کی بنیاد پر حکومت کی طرف سے پانچ سال تک وظیفہ ملتا رہا۔ الٰہ آباد کے ایک پاٹھ شالہ میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے پھر بنارس ہندو یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہوئے۔

شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ عمر خیام، غالب، مومن، ذوق اور علامہ اقبال کے کلام سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کی قومی نظموں سے بہت متاثر تھے۔ وہ تنگ نظری سے بہت دور تھے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی میں جب عربی، فارسی اور اردو کا شعبہ علاحدہ نہیں تھا، تب پروفیسر شیام نرائن لال ان زبانوں کے ادب کو بھی پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

آج خود آ گئے منانے کو — زندگی مل گئی فسانے کو

گا رہا ہوں میں غم چھپانے کو — کون سمجھے مرے ترانے کو
شاخ گل ہے نہ آشیانہ ہے — پھر بھی کہتے ہو مسکرانے کو
پھونک کر آشیاں بھی دیکھ لیا — کچھ سکوں مل گیا زمانے کو
درد آج کیوں مضمحل سا ہے — کیا پتا مل گیا زمانے کو
مضمحل عزم سے سمجھ لینا — بات کیا رہ گئی بنانے کو

عمر رفتہ نے مجھ کو سمجھایا
زندگی پائی ہے گنوانے کو

سنبھالے لاکھ ہم سینے میں دل کو — مگر دل پھر بھی بھر آئے تو کیا ہو
وہ سمجھاتے ہیں دیوانے کو لیکن — جو دیوانہ مچل جائے تو کیا ہو
چھپانے کو چھپا لوں اپنے آنسو — انھیں کی آنکھ بھر آئے تو کیا ہو
یہ چپکے چپکے تنہائی میں رونا — کوئی ایسے میں آجائے تو کیا ہو
متاعِ زیست اپنا غم ہے لیکن — جو یہ دولت بھی چھن جائے تو کیا ہو
نظر اٹھی ہے میخانہ لیے پھر — جو پیمانہ چھلک جائے تو کیا ہو
بہاروں میں مری صحرا نوردی — طبیعت خود بہل جائے تو کیا ہو
سنانے کو سنا دوں قصۂ غم — نہ ان کو گر یقیں آئے تو کیا ہو

شب فرقت ہے اور اُن کا تصور
سحر چپکے سے آ جائے تو کیا ہو (۴۷)

صابر، اکھوری سیتل پرساد

اکھوری لچھمن سہائے کے بیٹے، قوم کے کایستھ اور میگرہ (گیا) کے رہنے والے تھے۔ بچپن سے اردو شاعری کا مذاق تھا۔ مجموعہ کلام بھی ترتیب دیا تھا۔ نمونۂ

کلام یہ ہے:

بڑھنے لگا تعظیم کو ہر خارِ مغیلاں
دیکھا جو کہیں دشت میں مجھ آبلہ پا کو

گردش چرخ سے گھبراتا ہے کیوں دل مرا
شاید اس پردے میں پنہاں کوئی حکمت ہوگی

۱۹۲۵ء میں دیوان مرتب کر رہے تھے۔ ماہنامہ تاج گیا میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔
یہ غزل اردو سبھا گیا کے طرحی مشاعرے کے لیے کہی گئی تھی، جو تاج گیا بابت اگست ۱۹۲۲ء، ص ۶۱ پر شائع ہوئی تھی۔

کام پورا ہو خاک بسمل کا — ہاتھ اوچھا لگا ہے قاتل کا
جمع ہیں شاعرانِ خوش گفتار — جم گیا رنگ آج محفل کا
چاند دلہن ہے تو شمس ہے نوشاہ — جوڑا اچھا ملا مقابل کا
کیوں نہ صابر مجھے مسرت ہو
آج نکلا ہے حوصلہ دل کا

اکھوری سیتل پرساد صابر میگروی نے نظم ''خیر مقدم'' ۷ بندوں پر مشتمل کہی تھی، جس میں گیا شہر میں کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں کی آمد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ نظم تاج گیا بابت جنوری ۱۹۲۳ء کے کانگریس نمبر میں ص ۳۸-۴۰ شائع ہوئی ہے۔ گیا کانگریس پارٹی کے صدر چترنجن بہادر تھے۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

خیر مقدم

خزاں تھی ہم صفیرو! کیا بہار اب آنے والی ہے
شجر کیوں جھومتے ہیں مست کیوں پھولوں کی ڈالی ہے

ہر اک انداز دلکش ہے، ادا ہر اک نرالی ہے
زبانِ عندلیب باغ صَرفِ خوش مقالی ہے
نظر جس سمت جاتی ہے ادھر ہے باغباں اپنا
نئی ہے سرزمین اپنی نیا ہے آسماں اپنا
کہیں پر اپنا لیڈر ہے کہیں پر میہماں اپنا
کہیں جو رہنما اپنا کہیں جو کارواں اپنا
کہیں لہرا رہا ہے شان و شوکت سے نشاں اپنا
ہر اک ہے مہرباں اپنا ہر اک ہے رازداں اپنا
غرض نو روز ہے ہر سمت ہر سو رنگ ہولی ہے
بھری گلہائے قومی سے صبا کی آج جھولی ہے
یہ عزت دیں گی سب مل کر کہاں اُمید تھی ہم کو
گیا میں آئیں گی لیڈر کہاں امید تھی ہم کو
کھلے گا قوم کا دفتر کہاں اُمید تھی ہم کو
بہت ہے آپ کا تشریف سے عزت بڑھا دینا
قدم سے ذرّۂ ناچیز کو سورج بنا دینا
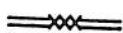
صبا، پرتھی چند لال

پورنیہ کے رئیس تھے اور شوقؔ نیموی کے شاگرد۔ ان کا ایک شعر ملتا ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

عشق لیلیٰ کا اگر قیس کو کامل ہوتا
مانع دید نہ کچھ پردۂ محمل ہوتا (۴۸)

جفائے دوست کا شکوہ جو بار بار کیا
دل حزیں نے محبت کو شرمسار کیا
ہمیشہ جس کو دل و جاں سے ہم نے پیار کیا
اسی نے اس دلِ ناداں کو داغدار کیا (۴۹)

صبرؔ، بابو یر مانند

آرا ٹاؤن اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بدرؔ آروی کے شاگرد۔ ''کریما'' کی طرز پر ''رحیما'' نظم کی تھی (۵۰)۔ اشعار نہیں مل سکے۔
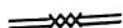
صنمؔ بابو، امبیکا سہائے

۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے، منشی جگن ناتھ کے صاحبزادے، قوم کایستھ۔ موضع ہرنام ڈیہہ ضلع گیا کے رہنے والے تھے۔ خلشؔ گیاوی سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہوں:

بے فائدہ کیوں ہاتھ اٹھاتا ہے دعا کو
معلوم ہے دل کا ترے احوال خدا کو
لکھ آج صنمؔ تو وہ پھڑکتے ہوئے اشعار
تڑپا دے غزل اپنی سنا کر شعرا کو (۵۱)

صنوبرؔ، منشی بجرنگ سہائے

منشی گوپی ناتھ سہائے بلبل کے فرزند، محلہ پاندریبہ گذری پٹنہ میں رہتے تھے۔ سنہ پیدائش تقریباً ۱۸۸۵ء، میر باقرؔ کے شاگرد تھے۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں درگاہ شاہ ارزاں میں ہونے والے آل انڈیا مشاعرے میں جو غزلیں پڑھی تھیں وہ رسالہ تاج گیا میں شائع ہوئی ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:

اس دل زار میں جب عشق پری زاد آیا
نور حق دیدۂ باطن میں خدا یاد آیا

بت پرستی سے مرا دل ہے منور زاہد
دیکھ کر حسن بتاں مجھ کو خدا یاد آیا

کیا کہیں عاشق جانباز کا کیسا ہے نصیب
کوے جاناں سے بھی آیا تو یہ ناشاد آیا

کیسی تقدیر ہے مرغانِ چمن کی یارب
فصل گل آتے ہی گلزار میں صیاد آیا

مرغ دل لاکھوں گرفتار ہوئے دام میں آج
بال کھولے ہوئے جب باغ میں صیاد آیا

حیف صد حیف غم ہجر میں موت آئی مگر
سر بالیں نہ کبھی بانیِ بیداد آیا

غم پہ غم سہتے ہیں فرقت میں ترے اے ظالم
نالہ ہرگز نہ لبوں پر دمِ فریاد آیا

میں تو سر دینے کو مقتل میں کھڑا ہوں لیکن
خواب میں بھی نہ کبھی سامنے جلاد آیا

مر مٹے خاک ہوئے جس کے غم فرقت میں
قبر پر بھی نہ کبھی وہ ستم ایجاد آیا
خارِ غم چبھ گیا نشتر کی طرح دل میں مرے
جب کہ تیر نگہ یار مجھے یاد آیا
مجھ ستم کش کے سوا جور و جفا کے لیے ہائے
اے فلک تجھ کو کوئی اور نہیں یاد آیا
بے کسی کے سوا اس عالم تنہائی میں
کوئی آیا بھی تو وہ صورتِ جلّاد آیا
لوٹ آئی مری پھر جان مری آنکھوں میں
کون اس وقت دم مرگ مجھے یاد آیا
آتش ہجر سے جل بھن کے ہوا خاک یہ دل
پر نہ ہونٹوں پہ دھواں بھی دمِ فریاد آیا
دیکھ کر گلشن دل میں مرے داغوں کی بہار
حور و غلماں کو بھی گلزارِ ارم یاد آیا
ان کے آنے کی خبر سن کے پریشانی میں
حال کہنے کو زباں تک دلِ ناشاد آیا
نہیں قابو میں رہا دل نہ جگر پہلو میں
وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا
آبدیدہ ہوا تو دیکھ کے کیوں سوئے فلک
اے صنوبر تجھے بیٹھے ہوئے کیا یاد آیا (۵۲)
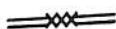
صہبا، رائے کنور بھائی

رئیس گیا، شاگرد اکبر داناپوری۔

نمونۂ کلام:

سجدے ہم کرتے ہیں وہ پاؤں جہاں رکھتے ہیں
جب تو دعوائے خدائی یہ بتاں رکھتے ہیں (۵۳)
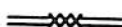
عاصی گیاوی، بابو نربدا پرساد

یہ جالندھر میں تھے۔ ان کی ایک غزل ماہنامہ تاج گیا، اگست ۱۹۲۲ء، ص ۴۴ پر شائع ہوئی تھی، جو یہ ہے:

کون کہتا ہے کہ وہ رونق وہ محفل نہیں
ہیں وہی سامان لیکن دیدۂ کامل نہیں

ہے عجب ہڑتال کا عالم دیار حسن میں
بھیڑ جانبازوں کی ہے لیکن کوئی قاتل نہیں

بندہ پرور آپ کے رخسار عالم سوز پر
ہے جھلک میری سیہ بختی کی، کوئی تل نہیں

کونسلوں میں بھر دیے بھاڑے کے ٹٹو آپ نے
کیا غضب ہے اپنی محفل میں بھی ہم شامل نہیں

آپ جی بھر کر جفائیں کیجیے بندہ نواز
شکوۂ بیداد سے واقف ہمارا دل نہیں

ظلم کرنے سے بڑھی ہے اور بھی شہرت تری
کون ہے جو تیری تیغِ جَور کا بسمل نہیں

آہنی کنگن پہن کر پا برہنہ جائیں گے
نو عروسِ حریّت کا حاجتِ محمل نہیں
قبر میں بھی ڈھونڈ کر اعمال بد نے یوں کہا
حضرت عاصیؔ اٹھو یہ آخری منزل نہیں

غزل

عیاں ہے عکس رخ لاجواب پانی میں
خدا کی شان ہے کہ ماہتاب پانی میں
تمام عمر رہا غرق بحر عشق میں، دل
ہمیں تو موت بھی آئی جناب پانی میں
عیاں یہ صاف ہے آبِ رواں کی لہروں سے
کہ موجزن ہے کسی کا شباب پانی میں
بوقتِ غسل لیا ترے دانت کا بوسہ
گہر کی آبرو کر دی خراب پانی میں
کسی کے روئے کتابی پہ آب ہے بے حد
لکھی گئی ہے یہ شاید کتاب پانی میں
پسینہ سینہ سے پونچھوں ہے ابتدائے شباب
نہ غرق ہو کہیں نخل شباب پانی میں
خدا کے واسطے دو گھونٹ پی لے اے زاہد
بھرے ہوئے ہیں مزے بے حساب پانی میں
ہوا جو بحر معانی میں غوطہ زن عاصیؔ
ملے یہ چند دُرِ لاجواب پانی میں (۵۴)

نظم

(لوک مانیہ تلک)

یہ جہاں کیا ہے فقط دھوکے کی ٹٹی سربسر
اک سرا ہے کہ ٹھہرتا ہے مسافر رات بھر
جب سپیدی سحر لاتی ہے پیغام سفر
صبح کا گھڑیال کہتا ہے کہ غافل کوچ کر
جس پہ تو سویا تھا وہ تابوت ہے بستر نہیں
اٹھ سنبھل ہو جا کمر بستہ یہ تیرا گھر نہیں

مال و دولت جاہ و حشمت شان و شوکت کس لیے
تاج کی حسرت تمنائے حکومت کس لیے
خواہش آرام، فکر عیش و عشرت کس لیے
اک تماشا کے سوا پیش نظر کچھ بھی نہیں
آئینہ خانہ میں سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

اس سرا میں آ کے کتنے عیش عشرت کر گئے
تاج جن کے سر پہ تھا دنیا سے خالی سر گئے
موت برحق ہے یہاں جو آئے اک دن مر گئے
انتہا یہ جو کہ خالی ہاتھ پیغمبر گئے
پیش کچھ چلتی نہیں حکم قضا کے سامنے
ایک دن جانا ہے بندے کو خدا کے سامنے

موت کی تمہید ہے یہ زندگئ بے ثبات

روئیے کس کس کو پاتے ہیں ہزاروں یاں وفات
جس کی ہستی نیک ہو فیضِ جہاں ہو جس کی ذات
وہ اگر مر جائے تو مر جائے ساری کائنات

ذات میں جس کی نمایاں ہوں ہزاروں خوبیاں
اس کا مر جانا ہے اک سوزِ نہاں بارِ گراں

آسمانِ ہند کے اے پُرضیا اختر تلک
اے بہارِ بے خزاں اے گیان کے ساگر تلک
بال گیانی، بال نیتا، بال گنگا دھر تلک
ہم کو تڑپاتی ہے تیری یاد رہ رہ کر تلک

اب نہیں باقی رہی طاقت لبِ فریاد میں
جی میں ہے مر جائیں گھٹ گھٹ کر تمھاری یاد میں

قوم کی محفل میں تو اک جلوۂ جانانہ تھا
تیری ہستی شمع تھی، ہندوستاں پروانہ تھا
دیکھتا تھا تو جسے وہ مست تھا دیوانہ تھا
بال گنگا دھر مجسم قوم کا میخانہ تھا

دیس دیپک، دیس گورب، دیس کا پیارا تھا تو
مادرِ ہندوستاں کی آنکھ کا تارا تھا تو

مقطع کا بند یہ ہے:

اب دعا ہم مانگتے ہیں تم سے اے سروِ چمن
گیان بھکشا دے سکھا ہم کو سودیسی کا چلن
دیس کے گاڑھے میں ہو ملبوس عاصیؔ تن بدن

آرزو یہ ہے ملے مرنے پہ کھدّر کا کفن

کیونکہ کھدر ہی سے بھارت ورش کا اُدّھار ہے

کاٹ تو کرتی ہے لیکن بے ضرر تلوار ہے (۵۵)

۱۳ بند کی یہ نظم لوک مانیہ تلک کو خراج عقیدت کے طور پر کہی گئی اور اس میں عاصؔی نے اپنے ہم وطنوں کو لوکمانیہ تلک کے اصولوں کو اپنانے کی تلقین کے ساتھ بے ثباتیِ عالم اور فانی زندگی کے متعلق ہشیار بھی کیا ہے۔ نظم میں عاصؔی نے جگہ جگہ ہندی کے عام فہم الفاظ بھی استعمال کیے ہیں
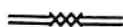
عروؔج، چتر بھوج سہائے

موضع کلیان پور آرا کے رئیس اور زمیندار تھے۔ بدر آروی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

پی کر شراب عشق میں بے خود ہوں ناصحا

جب رند ہو چکا تو ثواب و عذاب کیا

دھتکار ایک بوسہ پہ جب ہے عروؔج تب

"دے گا کوئی سوال کا میرے جواب کیا" (۵۶)

عطاؔ عظیم آبادی، رائے ایسری پرساد

عطاؔ عظیم آبادی کا نام رائے ایسری پرساد اور ان کے والد کا نام رائے پچھی پرساد تھا۔ یہ محلّہ کالی استھان عظیم آباد میں رہتے تھے۔ ان کا شمار بھی پٹنہ کے رؤسا اور

امرا میں ہوتا تھا۔ شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ شعر وسخن سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ قیسؔ عظیم آبادی لکھتے ہیں :

"عطاؔ نے جو ترقی شعر وسخن میں فرمائی وہ میرے ہم عصروں سے مخفی نہیں۔ آپ کی طبیعت فطری طور پر اس فن سے خاص مناسبت رکھتی تھی۔ خیالات کی شُستگی و پاکیزگی کا صحیح نمونہ آپ کا دلکش کلام ہے۔ بالخصوص فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین کو بہ سلاست نظم کرنا تو آپ کا خاص حصہ تھا۔ اپنا ضخیم دیوان مرتب کر چکے تھے اور اس کی اشاعت کا ارادہ تھا کہ حیات نے وفا نہ کی ...تقریباً ۶۰-۶۵ برس کی عمر میں ۱۳ر جنوری ۱۹۲۵ء کو ایک گھنٹہ بیمار رہ کر رحلت کی" (۵۷)۔

عطاؔ کی وضع قطع اور کچھ احوال کا تذکرہ کرتے ہوئے بدرؔ عظیم آبادی نے لکھا ہے :

"عطاؔ اپنی ذات گیروا لباس، داڑھی اور مونچھیں مُنڈی ہوئی، سر کے بال بھی بالکل مُنڈے ہوئے یا قینچی زدہ۔ ملنے کا انداز پورا ہندوستانی، بات چیت ہندوستانی، ان کے احباب ہندوستانی اور مشاغل بھی ہندوستانی۔ ان کی میم عیسائی تھی اور عمر بھر عیسائی رہی۔ اس سے دو بیٹے رائے صاحب کو تھے۔ بڑے کا نام میلکم سنہا اور چھوٹے کا نام اڈون سنہا تھا۔ انگریزی طرز پر ان دونوں کی تعلیم بچپن سے ہی ہوتی گئی ...رائے صاحب پکے ہندو تھے۔ کیا مجال کہ ان کے مذہبی معتقدات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ مذہبی پابندی کے ساتھ رواداری بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عیسائی بیوی اور عیسائی بیٹوں کے ساتھ بڑے میل ملاپ کے ساتھ زندگی بسر کر گئے۔ یہی حال مسلمان دوستوں کے ساتھ تھا" (۵۸)۔

بدرؔ عظیم آبادی نے شعر وشاعری سے عطاؔ کی دلچسپی اور ان کی عروض دانی کا

تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے:

''رائے ایسری پرساد عطاؔ کی ذات بھی دلچسپ تھی۔ ان کی گفتگو بھی دلچسپ ہوتی تھی۔ ان کا شعر پڑھنا بھی دلچسپ ہوتا تھا۔ غرض یہ ہمہ وجوہ دلچسپ تھے۔ احباب کے سامنے اپنا شعر پڑھتے تو فن عروض کے نکات بڑی شرح و بسط کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ اشعار کے معنی اور مضمون پر زور نہیں دیتے بلکہ عروض کے قواعد کے پورا ہونے کو شعر کی جان سمجھتے تھے۔ مشاعروں میں جاتے تو غزلیں پڑھنے والوں کی ہر غزل کے شعر کی آہستہ آہستہ تقطیع کرتے جاتے۔ کوئی شعر اگر تقطیع سے گرا ہوتا تو مشاعرے ہی میں ٹوک دیتے۔ مشاعروں کی غزلوں کے متعلق کوئی پوچھتا کہ رائے صاحب کس کی غزل کامیاب رہی؟ تو جواب دیتے، بھئی یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ کس کی غزل تقطیع سے گری ہوئی نہ تھی۔ میں تو غزلوں کی قدر و قیمت، فن عروض کے قواعد میں پورا اُترنے سے لگاتا ہوں۔ ان کے ساتھ یہی ہوتا تھا کہ مشاعروں میں غزلیں ختم ہو جاتیں اور یہ ان کی تقطیع میں لگے رہتے خود غزلیں لانبی لانبی کہتے تھے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر قافیے لاتے اور بعض تو ایسے کہ سننے والے چکرا جاتے۔ اکثر و بیشتر ان کی غزلیں فن عروض میں ان کے کرتب کا مظاہر ہوتیں۔ جب یہ پڑھنے کو بیٹھتے تو لوگ گھبرا اٹھتے''(۵۹)۔

رائے صاحب نے تقریباً تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی تھی۔ انھیں فن عروض سے گہری دلچسپی تھی۔ اس موضوع پر ان کی کتاب ''عروض ایشوری'' ہے جو چھپ چکی ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

خدا کے واسطے اتنا تو کہہ دو میرے قاتل سے

قیامت ہے ترا آنکھیں چرانا اپنے بسمل سے

گرے ہر ہر قدم پر منہ کے بل مستی میں اے ساقی
بہت رُسوا ہوئے میکش نکل کر تیری محفل سے

ہوا و حرص کو رہنے نہ دے گا اپنی حالت پر
مٹا دے گا عطا اس زنگ کو آئینۂ دل سے

پارسائی آج کل کی زور ہے   پارسا ہونا بہت ہی دور ہے
ہوتی ہے خانہ خرابی عشق سے   عاشقو! یہ مسئلہ مشہور ہے
شکر ہم کس کا کریں ناصح بتا   جو کہ شاکر ہے وہی مشکور ہے
جذبۂ دل کھینچ لایا ہے اسے   گھر ہمارا ہے کہ کوہِ طور ہے

ذکر میری وفا کا سن کے کہا   کیسی بے مثل یہ کہانی ہے(۶۰)

۱۹۲۲ء کے مشاعرہ واقع لودی کٹڑہ بہ مکان شاہ اقبال صاحب مرحوم جو غزل پڑھی تھی وہ ماہنامہ تاج گیا بابت دسمبر ماہ میں شائع ہو چکی ہے۔

آنکھ کے پردے کے باعث ہے یہ غفلت میری
دیکھنے دیتی نہیں مجکو حقیقت میری
آنکھ کے پردوں نے مخلوق بنا رکھا ہے
دیکھنے دیتی نہیں مجکو یہ صورت میری
جز صنم اور دکھائی نہ مجھے دیتا ہے
پیر میکش سے ہوئی جب سے کہ بیعت میری
چین سے سویا پڑا ہوں نہ اٹھاؤ مجکو

دیکھو دیکھو کہیں ٹھکراؤ نہ تربت میری

آبِ کوثر سے ذرا آنکھ تو دھو لے زاہد
تب نظر آئے گی جو کچھ کہ ہے حرمت میری

زر کی خواہش نہیں الفت نہ خلایق کی ہے
رند ہوں صبر و قناعت ہی ہے دولت میری

میں کسی شے کو بھی اپنے سے علیحدہ سمجھوں
یہ روا رکھتی ہے ہرگز نہیں نیت میری

کوئی گر نیچی نگاہوں سے جو دیکھے دیکھے
یار کی آنکھوں میں لاریب ہے وقعت میری

کس میرسی کے زمانہ میں خدا یاد آیا
آخرش کام مرے آئی یہ غربت میری

سجدہ کرنے ہی نے گمراہ کیا تھا مجکو
آ گئی اب تو سمجھ میں مری غفلت میری

میں عطاؔ رند ہوں اور طرز سخن ہے یکتا
مل نہیں سکتی کسی سے کبھی رنگت میری (۶۱)
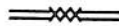
غنیمتؔ، بابو اجودھیا پرساد

موضع امانوی ضلع گیا کے رہنے والے تھے۔ قوم کے کایستھ۔ آریہ سماج میں ملازمت کر کے پنڈت ہو گئے۔ بیتابؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

بوستاں میں پھاڑ ڈالا گل نے اپنا پیرہن
سیر کو نکلا جو وہ گلگوں قبا برسات میں (۶۲)
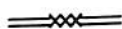
منی شنکر سریواستو

موضع، عنایت پور ضلع سارن کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ شیام کشور شاؔم کے لڑکے تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

کون کہہ سکتا ہے تقدیر بھی کیا ہوتی ہے
فائدہ کس کو ہے اور کس کی دوا ہوتی ہے
لاکھ تدبیر کی پر ایک نہ آشا ہوئی سِدھ
ناؤ کب چلتی ہے بگڑی جو ہوا ہوتی ہے

میرے دل میں چھپا کیا جانے کیا ہے　　کھٹکھٹا خار سا کیا جانے کیا ہے
ادھر بے چین اُدھر وہ چین میں مست　　یہ بھگون ماجرا کیا جانے کیا ہے
بھکاری ہوں مستا مت ظلم سے ڈر　　غریبوں کی دعا کیا جانے کیا ہے

جدائی سے تمھاری موت کے آنچل میں آپہنچے
نکل کر سورگ سے آدم تپت دنیا میں آپہنچے
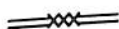
فتنؔہ، بابو شنکر دیال

منشی بنارسی لال کے فرزند۔ موضع اختیار پور کے رہنے والے اور بدؔر آروی

کے شاگرد تھے۔ آرا میں وکالت کرتے تھے۔ ۱۹۵۲ء تک بقید حیات تھے۔ قتیلؔ دانا پوری کے معاصر بھی تھے اور دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

اتنے ستم کیے کہ خدا یاد آگیا
میرا تو ان بتوں نے بڑا کام کر دیا

موت بھی آنے سے کرتی ہے حذر کیا کہیے
کس خرابی سے میں کرتا ہوں بسر کیا کہیے

زندگی گل کی طرح دنیا میں کرنا سیکھیے　　لاکھ ہوں صد چاک سینہ مسکرایا کیجیے
ہے حصول مدعا پیغام مرگ مدعی　　جو نہ پوری ہو کبھی ایسی تمنا کیجیے (۶۳)

چپ ہے کیوں اے یار کی تصویر بول　　کیوں کھنچی ہے مجھ سے بے تقصیر بول
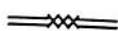
فداؔ سہسرامی، منشی کلدیپ سہائے

وکیل تھے۔ شاعری میں راحت سہسرامی کے شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

گلوں نے بلبل شیدا کو اشکبار کیا
مجھے تمھاری محبت نے بیقرار کیا (۶۴)
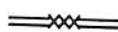
فردؔ لودی پوری، بابو رنجیت نرائن سنہا

فردؔ لودی پوری کا تذکرہ خلشؔ ندروی گیاوی مدیر ماہنامہ تاجؔ گیا نے اپنے

رسالے تاج (بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۰ء، ص۱) میں یوں کیا ہے:

"۱۹۲۰ء گیا تو سہی لیکن جاتے جاتے اپنے قدیم ہتھکنڈوں سے سیکڑوں گھر تباہ کیے۔ خصوصاً لوکمانیہ مہاراج بال گنگا دھر تلک کا انتقال پُر ملال ہوا۔ نواب سید بہادر حسین انجم لکھنوی کی رحلت، ابو الشفا حکیم شمس الحسن طبیب گیاوی کی مفارقت، اکھوری منشی سیتل پرساد صابرؔ میگروی کے فرزند ارجمند کی وفات حسرت آیات اور میرے عزیز دوست بابو رنجیت سنہا فرؔد لودی پوری کی ہمیشہ کی جدائی نے جو کچھ میری روح پر صدمہ پہنچایا وہ دل ہی جانتا ہے"۔

اس عبارت سے پتا چلتا ہے کہ فرؔد کا انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا اور وہ شاعر بھی تھے کیوں کہ خلش نے ان کا تخلص بھی لکھا ہے لیکن کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن ان کے ایک بیاض سے ان کا ایک شعر فصیح الدین بلخی نے نقل کیا ہے جو یہ ہے:

ششدر آئینہ ہے ان کا روئے تاباں دیکھ کر
اور انھیں سکتہ ہے آئینہ کو حیراں دیکھ کر (۶۵)

فریادؔ، منشی بدری نرائن

ولد منشی درگا پرساد، قوم کایستھ، موضع ندرہ، ضلع گیا کے رہنے والے۔ نقل نویس گیا کلکٹریٹ۔ انجمن چشم سخن ندرہ کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔ شاعری میں نسیمؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔

پوچھو نہ ہجر یار میں رونے سے کیا ہوا
سوکھا ہوا درختِ تمنا ہرا ہوا (۶۶)

ناز سے دیکھا تو آخر اک نظر میری طرف
دل جو تم نے لے لیا اس کا گلہ جاتا رہا

═══xxx═══

فطرتؔی عظیم آبادی، بابو پریالال

عظیم آباد کے طرحی مشاعرے کے لیے فطرتی نے ذیل کی غزل کہی تھی۔
مصرع طرح یہ تھا:

''شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری''

یہ غزل ماہنامہ تاؔج گیا، نومبر دسمبر ۱۹۲۲ء، ص ۱۳۵ پر شائع ہوئی ہے۔ مذکورہ مشاعرے کی تمام غزلیں اس شمارے میں شامل ہیں۔ تقریباً ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

جب سے برگشتۂ جہاں میں ہوئی عزت میری
پھیر لیتے ہیں وہ منہ دیکھ کے صورت میری

دل و جاں نے بھی نہ کی وقت پہ شرکت میری
حیرت افزا ہے زمانے میں مصیبت میری

حسنِ جاناں پہ نظر پڑتے ہی جاتے رہے ہوش
اک اشارہ میں لٹ گئی دولت میری

جس کی اُمید پہ بیٹھا ہوا دنیا میں رہا
ہائے اس نے کبھی پوچھی بھی نہ حالت میری

سر قلم کر دے مرا شوق سے قاتل لیکن
حشر میں رنگ دکھا دے گی شہادت میری

یا الٰہی مرے دشمن کو بھی یہ دکھ نہ دِکھا

جس مصیبت سے کٹی ہے شبِ فرقت میری

اب میں اُمید کروں بعد فنا کیا ان سے
زندگی میں جو نہ نکلی کبھی حسرت میری

ان کے سب ظلم و ستم سہتا ہوں دل پر لیکن
ان سے پھرتی ہی نہیں پھر بھی طبیعت میری

میں جدا سب سے ہوں دنیا میں نہیں مجھ سا کوئی
کس سے ملتی ہے بتا دے کوئی صورت میری

کس جگہ فکر نہیں ان کی، نہیں ان کی تلاش
ان کا دیدار ہو ایسی کہاں قسمت میری

ظلم سہتا رہا اُف تک نہ زباں پر آئی
فطرتی آپ نے دیکھی یہ شرافت میری (۶۷)
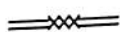
قیسؔ، رام پرساد

والد کا نام سنجیون لال ریاست ٹکاری (گیا) میں دیوانی راج تھے۔ قیسؔ گیا میں وکیل تھے۔ اردو شاعری کا نہایت شوق تھا۔ گیا میں ایک لٹریری کلب بھی قائم کیا تھا، جس میں ہر ماہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اکبؔر داناپوری کے شاگرد تھے۔ ۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

چلے باغ دنیا سے کیا لے کے ہم
نہ کچھ رنگ لائے نہ پھولے پھلے

عجیب شان سے دیکھا ہے اس کو پہلو میں
ہمارے خواب کی تعبیر دیکھیے کیا ہو

شوق سے آئے تھے تربت کے مٹانے کے لیے

چپ کھڑے ہیں آپ کیوں گورِ غریباں دیکھ کر (۶۸)

۱۹۹۳ء میں ان کا مختصر مجموعۂ کلام ''یادگارِ قیس'' شائع ہوا تھا۔ جس کا دیباچہ شفق عماد پوری نے لکھا ہے۔ لٹریری کلب گیا کے گلدستے میں بھی ان کا کلام شائع ہوا تھا۔

ایک غزل ملاحظہ ہو:

میرا کلب ہمیشہ ہی پھولا پھلا کرے
ہو کوئی فصل یہ تر و تازہ رہا کرے

انسان کس زبان سے تیری ثنا کرے
اک مشتِ خاک حمد خدا کیا ادا کرے

کب کہتے ہیں یہ ہم کوئی ہم سے وفا کرے
ہم سب میں خوش ہیں کوئی وفا یا جفا کرے

مجھ سے مریض غم کی کوئی کیا روا کرے
ہاں وہ دوا کرے جو کوئی معجزہ کرے

لیلا وشوں کے غم میں نہ کب تک گھلا کرے
آٹھ آٹھ آنسو قیس نہ روئے تو کیا کرے

نیرنگیوں میں یہ ترا شاگرد ہے اگر
ہر روز چرخ ایک کرشمہ ادا کرے

تم پر نثار ہم ہوں نہ ہو دل تمھارا صاف
تم یوں بھی خوش نہ ہو تو کوئی مر کے کیا کرے

یوں تو جہان میں ہیں بہت غیرت مسیح
میرا مسیح وہ ہے جو میری دوا کرے

تسبیح ہاتھ میں یہ دعا ہے زبان پر
آجائے میرے گھر میں وہ کافر خدا کرے
دو دن کی زندگی میں عداوت کسی سے کیا
یہ دن ہنسی خوشی میں بسر ہوں خدا کرے
نام اس قلم کا خامۂ جادو نگار ہے
مضموں جو تیری چشم سیہ کا لکھا کرے
میں نے کہا جوان سے کہ مرتا ہوں آپ پر
بولے یہ مسکرا کے مرو تم خدا کرے
اب قیسؔ کو بنا دیا کچھ اور عشق نے
لیلیٰ میں اس کے نام کی سمرن جپا کرے

═══xxx═══
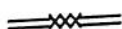
کششؔ، بابو گوبند پرساد

والد کا نام منشی گنگا پرساد تھا۔ موضع ندرہ ضلع گیا کے رہنے والے اور حافظ عبدالاحد مشفقؔ شیرگھاٹوی کے شاگرد تھے۔
نمونۂ کلام یہ ہے:

اپنی تو سجدہ گہ ہے درِ پیر مئے فروش
دیر و حرم سے کام نہ کچھ خانقاہ سے (۶۹)

═══xxx═══
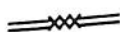
کشتہؔ، بابو اودھ کشور پرساد (۷۰)

ان کی پیدائش ۱۸۹۳ء میں اور وفات ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام

بابو نند کشوری پرساد تھا۔ یہ موضع پردھہ ضلع گیا کے رہنے والے تھے اور فن شعر و شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ڈراما نویسی سے بھی خاص شغف تھا۔ پھول پر پھول، انوکھی برچھی اور چند دوسرے ڈرامے ان کے لکھے ہوئے ہیں۔ شاعری میں پہلے خلش ندروی سے پھر خواجہ عشرت لکھنوی سے اور بعد میں نوح ناروی سے اصلاح لینے لگے۔ دیوان مرتب تھا(۱۷)۔ ماہنامہ تاج گیا میں اکثر ان کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔نمونۂ کلام یہ ہے:

پاس ادب یہ تھا کہ میں تڑپا نہ وقت ذبح
چھینٹیں پڑیں نہ خون کی دامانِ یار پر

ہجر کی شب یوں ہجوم داغ میرے دل میں ہے
گویا اک بزمِ چراغاں یار کی منزل میں ہے
کوئی حیراں، کوئی نالاں اور کوئی دم بخود
آئینہ خانہ کا نقشہ آپ کی محفل میں ہے
ظلم سہ کر یہ ہیں خنداں ظلم کر کے تم ہو خوش
تم سے کچھ شوخی زیادہ میرے زخم دل میں ہے
لیلیٰ و مجنوں فسانہ ہو گئے اس دور میں
میرا ان کا تذکرہ ہر بزم ہر محفل میں ہے
آپ کھنچ کھنچ کر چلے آتے ہیں مشتاقانِ قتل
یہ کشش کیسی الٰہی خنجر قاتل میں ہے
آپ اٹھ کر گھر چلے یہ روٹھ کر سوئے عدم
آپ سے نخرہ زیادہ آپ کے بسمل میں ہے

یہ ادا اُس بت کی کشتہ کر گئی مجھ کو حلال
کیا کہا پھر تو کہو کیا کیا تمھارے دل میں ہے(۷۲)

کشتہ نے یہ ذیل کی غزل آل انڈیا مشاعرہ منعقدہ گیا(۲۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء) میں پڑھی تھی جو بعد میں تاج، فروری - مارچ ۱۹۲۳ء میں ص ۱۰۰ پر شائع ہوئی۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ کشتہ اس آل انڈیا مشاعرہ کے نائب صدر تھے۔ مصرعۂ طرح تھا:

"سر بکف پھرتے ہیں ہم لیکن کوئی قاتل نہیں"

لاکھ حسن ظاہری دکھلاؤ ہم قائل نہیں
اب وہ نادانی نہیں، وہ دن نہیں، وہ دل نہیں

راز کچھ تو ہے کہ ملتا تجھ سے اپنا دل نہیں
تو مرے لائق نہیں یا میں ترے قابل نہیں

ہے ہماری آہ دل کا بھی بغاوت میں شمار
آپ کا تو ظلم بھی ہے ظلم میں داخل نہیں

ہو خطا ڈائر کی اور گاندھی مرا بھگتے سزا
عدل کی حد ہو چکی تم سا کوئی عادل نہیں

پھوٹ سے کب تک اٹھائے گا ستم گر فائدہ
تا بہ کہ ہر انڈین کا ایک ہو گا دل نہیں؟

شور تھا کشتہ کہ آئی ہے مشین گن ہر طرف
"سر بکف پھرتے ہیں ہم لیکن کوئی قاتل نہیں"
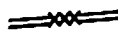
کشور عظیم آبادی، نند کشور لال

محلہ لودی کٹرہ پٹنہ میں رہتے تھے اور بچوں کو پڑھاتے تھے اس لیے لوگوں

میں ماسٹر نندکشور کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اکثر مشاعروں میں غزلیں پڑھتے تھے (۷۳)۔

ان کی دوغزلیں عظیم آباد کے ۱۹۲۲ء کے طرحی مشاعرے کے لیے لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ مشاعرہ کی طرحیں یہ تھیں :

(۱) ''شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری''

(۲) ''دیارِ ساقیِ کوثر میں آکے بیٹھے ہیں''

ان کی دونوں طرح میں یہ غزلیں ماہنامہ تاج گیا بابت نومبر دسمبر ۱۹۲۲ء، ص ۱۴۰ پر شائع ہوئی ہیں۔ یہ مشاعرہ پٹنہ سیٹی میں اقبال منزل میں قیس عظیم آبادی کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔

روز جس بزم میں ہوتی ہو شکایت میری
کب وہاں چاہے گی جانے کو طبیعت میری

غم نہیں اس کا اگر لٹ گئی دولت میری
میرے اللہ سلامت رہے عزت میری

داستاں قیس کی اک قصۂ پارینہ ہے
آکے سن جایئے اب تازہ حکایت میری

خیریت پوچھ رہے ہیں جو مری ہنس ہنس کر
کر چکے ہیں یہی رو رو کے شکایت میری

پاؤں رکھنے کی جگہ کوچۂ قاتل میں نہیں
دیکھیے اب کہ کہاں بنتی ہے تربت میری

گردشِ چشم فسوں ساز کا میں کشتہ ہوں
سب کی آنکھوں میں پھرا کرتی ہے تربت میری

میرے رونے سے وہ گھبرائے ہوئے ہیں کشور
ظاہر اغیار پہ ہو جائے نہ الفت میری

وہ بے حجاب چمن میں جو آ کے بیٹھے ہیں
پڑی یہ اوس کہ گل منہ چھپا کے بیٹھے ہیں
جو ان کے سایۂ گیسو میں آ کے بیٹھے ہیں
مزا وہ کالی گھٹا کا اٹھا کے بیٹھے ہیں
عدو کا غنچۂ خاطر کھلا کے بیٹھے ہیں
ہمارے پہلو میں تیوری چڑھا کے بیٹھے ہیں
کسی کی آنکھوں سے آنکھیں لڑا کے بیٹھے ہیں
ہم اپنے آپ کو حیراں بنا کے بیٹھے ہیں
وہ بھیڑ دیکھ کے کہنے لگے خدا کی پناہ
ہماری جان کے گاہک یہ آ کے بیٹھے ہیں
سمجھ کے سوختۂ آتش فراق اپنا
وہ میری خاک سے دامن بچا کے بیٹھے ہیں
کسی طرح تو دلِ مضطرب کو چین آئے
تمھارا نقش تصور جما کے بیٹھے ہیں
گئے ہیں سیر چمن کو وہ غیر کے شامل
ہماری راہ میں کانٹے بچھا کے بیٹھے ہیں
خدا گواہ ہے کٹتی ہے چین سے کشور
ہم اپنی مستی کو جب سے مٹا کے بیٹھے ہیں

کلدیپؔ، منشی ٹھاکر کلدیپ نرائن سنگھ

سہسرام میں وکیل تھے۔ راحت سہسرامی کے شاگرد۔ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

عارض و افشاں و کاکل کے تصور میں تیرے
صبح تک گنتے رہے کلدیپؔ تارے شام سے (۷۴)

═══xxx═══

گلوارا، بابو رامیشور پرساد
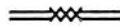
عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ پیشہ وکالت تھا۔ ''یارانِ میکدہ'' مرتبہ محمود علی خاں صباؔ کے لیے انھوں نے اپنے حالات خود لکھ کر دیے تھے، جن کا خلاصہ یہ ہے:

گلوارؔا کی ولادت ۱۲؍مارچ ۱۹۰۹ء کو ان کے جدّی مکان گلوارا ہاؤس محلّہ مچھرہٹہ پٹنہ سیٹی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام بشوا ناتھ پرساد تھا جو ایک تاجر تھے۔ ۱۹۲۴ء میں محمڈن اینگلو ربک اسکول پٹنہ سیٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر بی.اے. کیا اور وکالت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں پریکٹس شروع کی۔ لیکن والد کی علالت اور ضعیفی کے سبب اپنے آبائی پیشہ تجارت کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ البتہ عوام کی خدمت کرنے کا جو جذبہ ان کے دل میں تھا اس کے لیے انھیں ضرور موقع مل گیا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں پہلی بار پٹنہ پٹنہ سیٹی میونسپلٹی کے کمشنر منتخب ہوئے اور ۱۹۵۴ء میں کاؤنسلر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں کارپوریشن کے پہلے ڈپٹی میئر مقرر ہوئے۔

گلوارا نے بتایا کہ ان کے گھر والوں کی زبان اردو ہی تھی۔ اردو کا مضمون لے کر بی.اے. کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔ اردو کے سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ:

''اردو ہمارے ملک کی بڑی پیاری اور میٹھی زبان ہے۔
بولنے میں مزیدار، سننے میں خوشگوار اور سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس

کی شاعری میں جو لطف ہے وہ میں نے کسی اور زبان میں نہیں پایا ہے"۔
اپنی شاعری کے بارے میں انھوں نے بنایا تھا کہ جب کبھی ترنگ اٹھتی ہے تو شعر کہہ لیتا ہوں اور دوستوں کے اصرار پر مشاعروں میں پڑھ لیتا ہوں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

تم رنگ دیکھنا دل دیوانہ وار کا — بس منتظر ہوں آمد فصل بہار کا
مجھ سے قفس نصیب کو کیا کام اے ندیم — موسم خزاں کا ہو کہ زمانہ بہار کا
جلتے ہیں اور بجھتے ہیں امید کے دیے — یہ واقعہ ہے میری شب انتظار کا
عجلت یہ ہے کہ پشت ہوا پر سوار ہے — کس کی تلاش میں ہے مسافر غبار کا
مجھ سے غدا کے واسطے دامن بچھا دیا — احسان ہے یہ سایۂ دیوار یار کا
اس سے بدرجہا تھی غنیمت خزاں کی فصل — جیسا گزر رہا ہے زمانہ بہار کا

گلوآرا کوئی لاکھ جفائیں کیا کرے
دامن چھٹے نہ ہاتھ سے صبر و قرار کا

مجھے ہے نالہ و آہ و فغاں سے کام ابھی — زبانِ شوق نہ لے خوش دلی کا نام ابھی
زبانِ شوق نے گو لاکھ اختصار کیا — مگر ادا نہ ہوا حاصل کلام ابھی
اٹھا وہ ابر سیہ میکدے سے جا واعظ — کہ رند کرتے ہیں تیرا کچھ احترام ابھی
مری حکایت دل سن کے وہ یہ کہتے ہیں — ہمیں تمھاری صداقت میں ہے کلام ابھی
بس آج ہو گئے ہم ناز حسن کے قائل — کہ منتوں سے بھی نکلا نہ کوئی کام ابھی
جو کرنا چاہتے ہو کل وہ آج ہی کر لو — ضرورت آج ہو جس کی کرو وہ کام ابھی

بنانا دیش کو پھر رام راج گلوآرا
تم اپنے آہوئے دل کو تو کر لو رام ابھی

گوہرؔ، بھوانی پرساد

گیا کے رہنے والے تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

کھول دے میخانہ کر بابِ کرم آراستہ
لطف ہے ساقی مئے گلفام کا برسات میں (۷۵)

لعلؔ رجن پوری

نام منّی لعل، تخلص لعلؔ، والد کا نام شری اودھ بہاری لعل، موضع رجن پورہ، تھانہ مہاراج گنج ضلع سیوان کے رہنے والے تھے۔ محکمہ رجسٹری یوپی میں ملازم تھے۔ تاریخ ولادت وغیرہ نہیں مل سکی۔ شعر و شاعری کا ذوق تھا اور حکیم مولوی ظہیر الدین ظہیرؔ سیوانی نیز نیّرؔ چھپروی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

نہ جانے کون سی منزل پہ ہے دیوانگی اپنی
سمجھتا ہوں کسی کی زندگی کو زندگی اپنی

تمناؤں کی مجبوری سے کچھ سہمی ہوئی سی ہے
نہ جانے ورنہ کیا کر ڈالتی دیوانگی اپنی

کریں اے ضبطِ غم کیوں ان سے اظہارِ تمنا ہم
ابھی تو ہوش میں ہے خیر سے دیوانگی اپنی

کلیجہ سے لگا رکھا ہے ہر داغ تمنا کو
گزرتی ہے کچھ ایسی کشمکش میں زندگی اپنی

کہاں جائیں سنائیں اب کسے ہم ماجرائے غم
کسی کی یاد میں اب کاٹنی ہے زندگی اپنی
سجود یار کب محتاج ہے مندر کا مسجد کا
جہاں گردن جھکا دی بس وہیں ہے بندگی اپنی
ازل ہی سے متاعِ زیست ہے اے لعلؔ غم اپنا
اسی کے دَم سے نور افشاں ہے شمعِ زندگی اپنی

غزل

کسی کی یاد میں دل کا مرے دستور ہو جانا
تمناؤں کا میرے بے سبب مسرور ہو جانا
یہی احسان کیا کم ہے جو دل میں وہ فروزاں ہیں
نہ جانے ورنہ اس دل کو تھا کب بے نور ہو جانا
میں جس محفل میں جاؤں اپنی محرومی لیے جاؤں
کہ رزمِ عشق میں اپنا یہی دستور ہو جانا
جنھیں ناکامیوں سے کام ہے کچھ وہ سمجھتے ہیں
کہ کیا شے ہے کسی انسان کا مجبور ہو جانا
محبت پر نہ کچھ الزام آجائے دلِ ناداں
وفا کی راہ میں جل کر چراغِ طور ہو جانا
مرے ہاتھوں سے ساغر لعلؔ لے کر ناز سے بولے
نہیں اچھا مرے محبوب کا مخمور ہو جانا (۷۶)

لعلؔ گیاوی
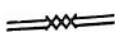
ششر کمار لعلؔ، والد کا نام ڈاکٹر نول کشور پرساد۔ موضع کھرانٹی اورنگ آباد (بہار) کے رہنے والے۔ ولادت ۱۵/نومبر ۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ ان کے والد سنسکرت، اردو، عربی، فارسی اور ہندی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اپنے والد سے مذکورہ زبانوں کی تعلیم حاصل کی اور شعر و شاعری سے طبیعت کو ایک والہانہ لگاؤ ہوا۔ شاعری کا نمونہ یہ ہے:

لعلؔ کی زندہ دلی پر یہ رقیبوں نے کہا
کسی حالت میں اسے ہاتھ نہ ملتے دیکھا (۷۷)

═══

لچھمی، لچھمی نرائن عظیم آبادی

لچھمی نرائن لچھمی عظیم آبادی کی یہ غزل عظیم آباد کے طرحی مشاعرے کی ہے جو تاج گیا، بابت نومبر دسمبر ۱۹۲۲ء، ص ۱۴۲ پر شائع ہوئی ہے۔

کیوں مجھے چھوڑ چلی دشت میں وحشت میری
کچھ دنوں اور بھی کرتی یہ رفاقت میری

وعدے کرتے بھی ہیں پھر آپ مکرتے بھی ہیں
یہ سمجھتے ہی نہیں بڑھتی ہے وحشت میری

پردے ہی پردے میں عشاق سے وہ کہتے ہیں
حشر سے پہلے نہ دیکھے کوئی صورت میری

جس کو کل رات بہت غور سے سنتے تھے حضور
قیس کا قصہ نہ تھا وہ تھی حکایت میری

جور پر جور سہے لاکھ مگر اُف بھی نہ کی
پھر ستم دیکھو وہ کرتے ہیں شکایت میری

آنکھ نرگس کی، دہن غنچہ کا ہو جس گلی کا
ٹوٹ کر آئے نہ کیوں اس پہ طبیعت میری
میں وہ ناکام محبت ہوں ازل سے ہمدم
مرتے مرتے بھی نہ نکلی کوئی حسرت میری
وادیٔ عشق میں تجھ سا جو نہ ہوتا رہبر
اے جنوں سچ ہے کہ پڑتی نہیں ہمت میری
ابتدا جوش جنوں کی ہے ابھی کیا ہوگا
چار دن بعد غضب ڈھائے گی وحشت میری
منزلوں دور ابھی وصل کی ساعت ہوگی
اور مسرور ابھی سے ہے طبیعت میری
گردش دیدۂ جاناں کی بدولت کچھ بھی
مثل سرمہ کے پسی جاتی ہے تربت میری (۷۸)
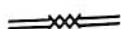
وکیل، رگھوبیر پرساد سنگھ

نام رگھوبیر پرساد سنگھ، تخلص وکیل رکھتے تھے۔ آپ ۱۶/نومبر ۱۹۰۲ء میں پورن چھپرہ، تھانہ کلیان پور، مشرقی چمپارن میں پیدا ہوئے۔ تاریخ وفات ۱۶/اگست ۱۹۸۴ء ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے موضع کے مدرسہ میں اردو زبان سے شروع ہوئی اور بی. بی. جی. کالجیٹ اسکول مظفر پور سے میٹرک، پٹنہ یونیورسٹی سے بی. اے. اور ایم. اے. (انگریزی) کی سند حاصل کی۔ پھر وہیں سے ایل. ایل. بی. کی ڈگری بھی حاصل کی اور مظفر پور میں وکالت کرنے لگے۔ لیکن مظفر پور آپ کو راس نہیں آیا۔ چنانچہ اپنے آبائی وطن واپس آئے اور تاحین حیات موتیہاری کورٹ میں وکالت کے

پیشہ سے منسلک رہے۔ آپ نے شعر و سخن کی ابتدا ۱۹۳۱ء سے کی۔ آپ عترت حسین عترت سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے(۷۹)۔

نمونۂ کلام:

معمہ راز ہستی کا نہیں سلجھا تو گھبرا کر
کوئی کعبہ گئے اور کوئی بتخانے چلے آئے

کوئی ہم کو بتا دو کعبہ والو بتکدہ والو
کہاں تھے ہم، یہاں کیوں ٹھوکریں کھانے چلے آئے

جو نہ کرنا تھا وہ کئے ہی کیوں ایسے لوگوں کو دل دیے ہی کیوں
کوئی پوچھے وکیلؔ صاحب سے درد سر مول لیے ہی کیوں

غزل

(۱)

عشق کرنا سکھا دیا ان کو جان دے کر دکھا دیا اُن کو
آج میں تہہ زمیں جا کر آسماں پر اٹھا دیا ان کو
دیکھتے ہی لحد کی خاموشی ہم نے سب کچھ سنا دیا اُن کو
دل تو دوچار دس نہیں ہوتا جیسا بھی ایک تھا دیا اُن کو
شیشۂ دل دکھا دکھا کے وکیلؔ تو نے پتھر بنا دیا اُن کو

---

(۲)

دل لگا کر زندگی دشوار کی کس بری حالت میں آنکھیں چار کی
میری حالت غم میں تو جو ہے سو ہے غیر ہے حالت مرے غم خوار کی

میں تو ان کی سادگی پہ مر گیا　　قسمیں دیتے ہیں مجھے اغیار کی
مر گیا، کہتا نہ تھا، مر جائیں گے　　شان دیکھی صادق الاقرار کی
دیکھ لی دنیا تری نیکی بدی　　اب چلیں دیکھیں ذرا اس یار کی
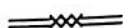
مائل، بابو بھولا ناتھ

مدھے پورہ ضلع سہرسہ سابق ضلع بھاگل پور میں منصف تھے۔ ان کی وفات ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ جگیشر پرساد خلشؔ ندروی گیاوی (۸۰) نے جو قطعۂ تاریخ وفات کیا تھا وہ یہ ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مائل کا انتقال ۱۹۷۷ء سمبت میں ہوا تھا۔

آہ محسن ہمارے بھولا ناتھ　　منصفِ بے نظیر و اہل قلم
چل بسے سوئے گلشن جنت　　دے گئے دل کو داغ رنج و الم
کیا کہیں روح پر جو صدمہ ہے　　کیا بتائیں جو دل کا عالم ہے
صورت زلف منتشر ہے مزاج　　ابر کی طرح آنکھ پُرنم ہے

از سر برق یہ لکھی تاریخ
مدھ پورا ہے آج خانۂ غم
(۱۹۷۷ سمبت)

مائل کی ذیل کی غزل ماہنامہ تاج گیا فروری ۱۹۲۰ء میں چھپی تھی۔

غزل

فغاں کے ساتھ لب تک دم بدم آنے سے کیا حاصل
دلِ مضطر کو سمجھا دو کہ گھبرانے سے کیا حاصل

جو پیشانی کا لکھا ہے وہ پیش آنا ضروری ہے

تو پھر تقدیر کی باتوں پہ غم کھانے سے کیا حاصل

نصیحت ہم سے دیوانے کہیں سن کر سنبھلتے ہیں
کوئی ناصح کو سمجھا دے کہ سمجھانے سے کیا حاصل

ہماری جاں نثاری بھی کسی دن آزما دیکھو
یہ قصے لیلیٰ و مجنوں کے پڑھوانے سے کیا حاصل

نگاہِ مست ساقی سے ہے بزم مئے کی کیفیت
ہمیں پھر ساغر و مینا و میخانے سے کیا حاصل

داغ تپ فراق سے دل لالہ زار ہے — جو آہ منہ سے نکلی وہی شعلہ بار ہے
کیا پوچھتے ہو حسرتیں میری کہاں گئی — سب مرمٹی ہیں دل ہی میں سب کا مزار ہے
دستِ جنوں سے چاک گریباں ہوا تو کیا — تارِ نفس بھی اب تو مرا تار تار ہے
باتیں تری سمجھتے ہیں ناصح پہ کیا کریں — قابو میں اپنے کب دلِ بے اختیار ہے
کس بات پہ ہے پیکر خاکی تجھے گھمنڈ — دو دن کی زندگی بھی تو ناپائیدار ہے
پھر گل نیا کھلائے گا موسم بہار کا — پہلو میں بے سبب نہیں دل بے قرار ہے
تلووں کو کیوں نہ خارِ مغیلاں کی ہو ہوس — سودائی وہ جنوں مرے پر سوار ہے
دل کو تباہ کیجیے پر دیکھ بھال کے — یہ ٹوٹا پھوٹا گھر حرم کردگار ہے

مائل ترے کلام کا شائق ہے ہر کوئی
کچھ اور گل کھلا یہ زمیں پُر بہار ہے (۸۱)

مائل کی ایک غزل جو ۷ اشعار پر مشتمل ہے تاج جون ۱۹۲۰ء، ص ۲۱۸ پر بھی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

یا شرح سوزِ دل ہے یا درد کا بیاں ہے

جو شعر ہے ہمارا اک غم کی داستاں ہے

غم سے کب حال پریشاں نہیں دیکھا
کب اس دل صد چاک کو گریباں نہیں دیکھا
شکوہ مرے رونے کا عبث کرتے ہو یارو
کب زخم جگر کو مرے خنداں نہیں دیکھا
اِترا کے نہ چل کبک دری باغ میں اتنا
تو نے ابھی اس گل کو خراماں نہیں دیکھا
دیکھا تو حرم میں بھی پرستش ہے اسی کی
اس بت سا کوئی دشمن ایماں نہیں دیکھا
اے شمع شبِ افروز ترے حسن کا جلوہ
کس رنگ میں کس روپ میں پنہاں نہیں دیکھا
کھو بیٹھا ہے دل جو کہ تھا گنجینۂ اسرار
مائلؔ سا بھی ہشیار نگہباں نہیں دیکھا (۸۲)

مائلؔ کی غزلوں کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری زمانے کے مذاق کے عین مطابق تھے۔ ان کے کلام میں سادگی، روانی اور سلاست بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

مچھر داناپوری

چندر شیکھر پرساد سنہا، مچھر داناپوری فرزند منشی نورنگی لال مرحوم (ایڈوکیٹ) ۲۴ راگست ۱۹۱۴ء کو داناپور پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ بی.اے.، بی.ایل. کرنے کے بعد پٹنہ ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے اور مزاحیہ

شاعری کرتے تھے۔ ان کا کلام آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے بھی نشر ہوا کرتا تھا۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

گدھوں کی نسلوں میں گر نمایاں کر کے بھیجو گے
قباحت اس میں کیا ہے جب وہاں ڈھینچو نکلتے ہیں

پہلے سمجھتے ہیں جنھیں اہل خرد بدھو سمجھتے ہیں
کہ اب گھوڑے سے آگے. ریس میں ٹٹو نکلتے ہیں

سر اٹھایا جس نے رب کے سامنے　　مچھر اس مردود پر غالب ہوا
تھا شکستہ پا مگر نام خدا　　دیکھیے نمرود پر غالب ہوا (۸۳)

═══xxx═══
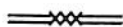
مشتاقؔ بابو جے ناتھ پرساد

حافظ ولی اللہ حیدر گہرؔ آروی کے شاگرد تھے نہ حالات مل سکے اور نہ کلام دستیاب ہوا (۸۴)۔

═══xxx═══

منتؔ، منشی گور بخش

محلہ دھولپورہ متصل بیگم پور عظیم آباد میں رہتے تھے۔ ان کی ایک بیاض بخط شاعر پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے، جس میں ان کا کچھ کلام ملتا ہے۔ یہ بیاض ۱۹۵۰ء کے بعد لکھی گئی ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

غضب ہیں یار کی ترچھی نگاہیں　　رگِ جاں چھیدتی ہیں تیر کیا ہے

پڑھا کس نے ہے خط پیشانیوں کا کہ تا معلوم ہو تحریر کیا ہے
عبث کہنا تمھارا ہے یہ منت
بتوں کے رو بہ رو تقریر کیا ہے (۸۵)

═══×××═══

منموہن کانت

تاریخ ولادت ۲/ جنوری ۱۹۲۸ء ہے۔ والد کا نام بابو راج کمار تھا۔ وطن موضع موکر تھانہ سہسرام تھا۔ ہندی میں ایم.اے. کیا تھا۔ ہندی کے ساتھ اردو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

ایسا لگتا ہے رات چاروں طرف گہری ہے
اور یہ زندگی بس ایک سلگتا سا اولا

سوپ بھر دھوپ باندھ لوں کہ ملے نہ ملے
گلاب باغ کا پتہ کہیں کھلے نہ کھلے (۸۶)

═══×××═══
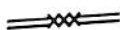
ناداںؔ، اکھوری پریاگ دت

اکھوری گردھاری لال کے فرزند، موضع دھیوڑھی، شیر گھاٹی ضلع گیا کے باشندے تھے۔ قوم کے کایستھ تھے۔ ڈالٹین گنج میں مختار تھے۔ شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے اور سریر کابری کے شاگرد تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ۶۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے بھائی اکھوری گوپی کشور گیا میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔

نمونۂ کلام:

اب تو روتا ہوں ہجر میں ناداں
دل لگایا تھا دل لگی کے لیے (۸۷)
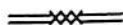
ناشاد، رام پرساد کھوسلا

رائے صاحب سالگرام کے فرزند۔ یہ پنجاب کے رہنے والے تھے لیکن زیادہ تر صوبہ بہار میں قیام کیا اور ایک طرح سے بہار کو وطن ثانی بنا لا۔ بقول فصیح الدین بلخی:

''۱۸۸۱ء میں راہوں ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں لاہور کے گورنمنٹ کالج سے انگریزی زبان و ادب میں ڈگری حاصل کی اور لاہور کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں آکسفورڈ جا کر فن تاریخ کی تکمیل کی اور ہندوستان واپس آکر لاہور کے سناتن دھرم کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس کے بعد حکومت نے ان کو ایجوکیشنل سروس میں لے لیا اور ایونشا کالج کٹک میں پروفیسر مقرر کیا۔ ۱۹۱۷ء میں کٹک سے تبدیل کر کے جی. بی. کالج (لنگٹ سنگھ کالج) مظفر پور میں پہلے نائب پرنسپل کے عہدے پر بحال کیا پھر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۳ء تک ٹی. این. بی. کالج بھاگل پور کے پرنسپل رہے۔ لیکن اس کے دوسرے سال پٹنہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ لیکن ان کو مظفر پور کا ماحول بہت مرغوب تھا اس لیے ایک سال کے بعد پھر مظفر پور واپس آگئے۔ تاریخ میں ان کی تصنیف سے ''سلاطین و روٴسائے مغلیہ'' ایک مشہور و معروف کتاب ہے۔ ملازمت ہی کے زمانے میں گورنمنٹ کی اجازت لے کر انھوں نے دوبارہ

انگلینڈ کا سفر کیا۔ اوّل ۱۹۱۸ء میں مہاراجہ پٹیالہ کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے وار کانفرنس میں شرکت کی اور پھر ۱۹۲۶ء میں مہاراجہ الور کے پرائیویٹ سکریٹری ہو کر انگلینڈ کی سفر کی''(۸۸)۔

ناشاد ایک ہمدرد انسان تھے۔ ان کے دل میں غریبوں اور مزدوروں نیز حاجت مندوں کا درد تھا۔ وہ ان کی حتی الامکان مدد کرتے تھے۔ شاعری سے بھی یک گونہ لگاؤ تھا۔ ۱۳؍ جون ۱۹۴۲ء کو وفات پائی۔ ان کا مجموعۂ کلام ''نالۂ ناشاد'' ہے، جو نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کے کلام میں تصوف و عرفان کے عناصر بھی بدرجۂ اُتم پائے جاتے ہیں۔ نظم ''نیا عبادت خانہ'' ان کی ایک شاہکار نظم ہے۔

نظم

مل کر بنائیں ایسا اک خانۂ عبادت
مندر نما ہو لیکن مسجد کی طرز کا ہو
مُرلی کی دُھن چھڑی ہو آواز ہو اذاں کی
چرچا پجاریوں میں قرآن و وید کا ہو
اک جام میں پڑا ہو تھوڑا سا آبِ زم زم
اس آب میں ذرا سا گنگا کا جل ملا ہو
پی پی کے جامِ اُلفت وہ بیخودی عطا ہو
ہر ایک کی زباں پر وحدت کا تذکرہ ہو
اپنے صنم کدے میں بت ہوں نئی طرح کے
جن کے لبوں پہ ہر دم توحید کی صدا ہو
آپس کا بیر چھوڑیں باز آئیں دشمنی سے
یہ ہو نثار دل سے وہ جان سے فدا ہو

دھو دھو کے ہم مٹا دیں آب یگانگی سے
گر لوح دل پہ اپنے حرفِ دوئی لکھا ہو
مذہب ہو اپنا ایسا جس سے ہر ایک دل میں
عزت ہو دیوتا کی تعظیم انبیا ہو
مٹ جائے کفر و دیں کا جھگڑا جہاں سے یارب
ناشاؔد کی زباں پر ہر وقت یہ دعا ہو

مذکورہ نظم ''نیا عبادت خانہ'' قومی یکجہتی، باہمی اتحاد اور یگانگت کے موضوع پر بہت بہترین نظم ہے۔ اس میں علامہ اقباؔل کی نظم ''نیا شوالہ'' کی دھمک محسوس ہوتی ہے۔ نہایت سبک اور رواں انداز میں ناشاؔد نے محبت و یگانگت کا پیغام دیا ہے۔

═══ ✕✕✕ ═══
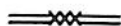
نطقؔ، بابو سوچیت نرائن سنہا

لودی پور ضلع گیا کے باشندہ تھے۔ احوال نہیں ملے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

پھولوں کی بو سے یاد ترے رُخ کی آ گئی
مر کر بھی مجھ کو چین نہ آیا مزار میں (۸۹)

═══ ✕✕✕ ═══
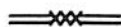
وحشیؔ مظفر پوری، نتھونی لال (۹۰)

نتھونی لال وحشیؔ مظفر پوری اگرچہ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے مگر شعر و

ادب سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی۔ وہ علامہ جمیل مظہری مرحوم کے شاگرد تھے۔ غزل اور مرثیہ گوئی کے میدان میں انھوں نے اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔ ان کے مرثیے، قدیم و جدید مرثیے کی روایت کو آگے بڑھانے میں بڑے معاون ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے شاعری میں اپنا ایک مخصوص مقام بھی بنا لیا ہے۔ اگرچہ وہ ہندو تھے لیکن خاندان پیغمبر سے انھیں والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

ہندو اگرچہ وحشیؔ بادہ پرست ہے
لیکن مئے محبت حیدر سے مست ہے

ایک مرثیہ میں اپنی شاعرانہ حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

معراج عقل و عشق ہے فکر رسا مری
دنیائے رنگ و بو میں بندھی ہے ہوا مری
موتی لٹا رہی ہے چمن میں گھٹا مری
جاتی ہے بت کدوں سے حرم تک صدا مری

کیوں نہ ہو کہ شاعر رنگیں بیاں ہوں میں
مستی فروش بادۂ چشم بتاں ہوں میں

وحشیؔ نے اپنے مرثیوں میں زیادہ تر ہندوستانی زندگی کی ماحول کو ہی برتا اور پیش کیا ہے۔ یہاں کی مشترکہ تہذیب اور کلچر کو بڑی خوبصورتی سے منظر کشی کی ہے۔

گنگا کی اٹھتی لہر ہے طبع رواں مری
متھرا کی کوئلوں سے سنو داستاں مری
رادھا کی انکھڑیوں کا ہے جادو زباں مری
ڈوبی ہوئی ہے پیت کی دھن میں فغاں مری

نغموں کے اضطراب میں جنبش ہے ساز کی
دل میرا بانسری ہے مرے نے نواز کی

واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسا جانگداز واقعہ تھا جس سے اسلام کو دنیا والوں کے سامنے خجل اور شرمندہ ہونا پڑا۔

وہ سانحہ کہ خون مشیت کا دل ہوا
اسلام جس سے کفر کے آگے خجل ہوا

وحشیؔ مظفر پوری کے کلام میں بڑی صفائی، روانی اور سادگی ملتی ہے۔ انھیں تاریخ اسلام بالخصوص واقعات کربلا کی پوری جانکاری تھی اور ساتھ ہی اپنے دھرم کی باتیں بھی خوب جانتے تھے۔
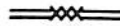
ہمرازؔ چھپروی، بابو بھگوتی پرساد سنگھ

تقریباً ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ قوم کے راجپوت تھے۔ زمینداری کے باعث آرام سے زندگی بسر ہوتی تھی۔ اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ مصوری اور موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ انگریزی میں رس النکار کے نام سے ایک کتاب ملتی ہے۔ شاعری میں محبوب احمد عنقاؔ چھپروی کے شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

سمجھنا ہم پریشاں تھے تمھارا خط نہیں پاکر
ہمارے خط کے مضموں میں اگر کوئی خط نکلے

محبت کی یہ انتہا ہو رہی ہے — کہ ان کی جفا پر وفا ہو رہی ہے
ستم پر ستم اور جتنا کرو تم — مرے درد دل کی دوا ہو رہی ہے
مرے گلبدن کی ہے کیا آمد آمد — معطر جو بادِ صبا ہو رہی ہے
مجھے چھوڑ کر اب کہاں جا رہے ہیں — مری دوستی [illegible] ہو رہی ہے

کسی سے کسی کا نہ دلبر جدا ہو یہی حق سے میری درا ہو رہی ہے
کسی کی محبت میں ہمرآز اب تو
طبیعت بہت مبتلا ہو رہی ہے

ماہنامہ تاج گیا جلد۳ نمبر۳ مارچ ۱۹۲۲ء میں چھپرہ کے طرحی مشاعرے کی غزلیں شائع ہوئی ہیں، جن میں ہمرآز چھپروی کی ایک غزل ص۹۳ پر ہے، جو یہ ہے:

یہ بندش رنگ لائی آپ کے گیسوئے پُرخم کی
سرِ محفل نظر پڑنے لگی اب غیر محرم کی
گلہ اب تک نہیں آیا زباں پر اس ستم گر کا
الٰہی آبرو رکھنا یہ میری چشم پُرنم کی
اُدھر قاتل نے لی تلوار جس دم آزمانے کو
اِدھر جوشِ محبت نے مری گردن وہیں خم کی
ستم ہے، چاہتا ہے دل جسے، اپنا نہیں ہوتا
محبت آپ کی ورنہ کسی سے میں نے کیا کم کی
مصیبت میں تمھیں ہمرآز دینا ساتھ ہے لازم
رہا کرتی ہے ورنہ یوں تو صحبت روز ہمدم کی
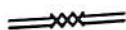
ہندو، بابو پریاگ رام

گیا کے رہنے والے۔ مائل بیتھوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۰۱ء میں شاعری کرتے تھے۔ گلدستۂ نسیم سحر میں ان کا کلام شائع ہوا تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

تصور میں آنکھیں تمھیں دیکھ لیں گی
کہاں تک چھپو گے کسی کی نظر سے (۹۱)

ہنرؔ گیاوی، رادھے شیام

ہنرؔ ۱۹۱۰ء میں گیا میں پیدا ہوئے۔ رفیع گنج ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ شاعری کا شوق تھا۔ رفیع گنج میں برابر شعر و شاعری کی نشستیں منعقد کرواتے تھے۔ اردو کے معروف شعرا میں فراقؔ گورکھ پوری، بسمل الہ آبادی، جگر مرادآبادی اور کشتہؔ گیاوی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ کبیر باغ ٹکاری روڈ گیا میں مستقل سکونت تھی۔

نمونۂ کلام:

مری پرواز اونچی عرش سے بھی حوصلے اونچے
مجھے محدود رکھیں گی زمین و آسماں کب تک (۹۲)
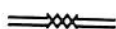
ہندوؔ گیاوی، منشی بھولا ناتھ

موضع کواتھ آرہ کے رہنے والے تھے اور شاعری میں سلیمان خاں جادوؔ کے شاگرد تھے۔ تاریخ ولادت معلوم نہیں ہوئی لیکن ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔ لٹریری کلب گیا کے گلدستہ میں ان کی غزل شائع ہوئی تھی۔

غزل

باہر نقاب سے کہیں وہ رُخ ذرا کرے
خورشید زرد رو ہو اگر سامنا کرے

سو بار آب گنگ سے منہ دھو لیا کرے
تب بحر حسن کا ترے وہ بت ثنا کرے

تعریف تیرے دنداں کی اے گل کیا کرے
سوکن صفت جو پیدا نرالا موتیا کرے

گر حال پر مرے تو کرم ساقیا کرے
خم بھی لگا دے منہ سے نہ اُف بھی ذرا کرے

بیٹھے ہیں اس کے کوچہ میں اب جو خدا کرے
جور و ستم کرے وہ صنم یا وفا کرے

کھینچا تھا جو کھنچا ترا نقشہ اے سیم تن
پیدا تو ایسا دوسرا دست خدا کرے

پیغام وصل سن کے یہ کہنے لگا وہ شوخ
لے فصد وہ ابھی ذرا اپنی دوا کرے

ہر گام پر جو گھنگرو بجاؤ گے اے صنم
کیوں کر ہر اک نہ قبر سے مردہ جیا کرے

اس بت کا دیکھنے کہیں پائے جمال تو
زاہد خدا کو چھوڑ دے مالا جپا کرے

اے شمع رو تو آ مری حالت زبون ہے
بتی کی طرح دل مرا کب تک جلا کرے

صورت ہے بدلی ابر کی گھنگھور ہے گھٹا
ساقی تمام شب ترا ساغر چلا کرے

بے عشق وہ صنم نہیں ملنے کا زاہدا
سو بار مسجدوں میں اگر تو جھکا کرے

تارے گریں زمیں پہ وہیں ٹوٹ ٹوٹ کر
ہنسنے میں منہ کو تو کہیں دنداں نما کرے

ہر طرح کا کمال ترے بانکپن میں ہے
چاہے تو اک پل میں قیامت بپا کرے

ہنؔدو جناب حضرت جاؔدو کے فیض سے
یہ رنگ شاعری ترا یوں ہی جما کرے (۹۳)

═══xxx═══
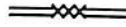
ہوشؔ، کامتا پرساد (۹۴)

کامتا پرساد ہوشؔ نے اپنے حالات خود لکھے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے:
انکی پیدائش ضلع گیا کے ایک گاؤں بیرمی میں ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام منشی گلاب لال تھا۔ کامتا پرساد کے والد نے ان کی اردو، فارسی کی تعلیم کے لیے کائستھ برادری کے ایک تعلیم یافتہ شخص چکر دھر پرساد کو مقرر کیا۔ منشی گلاب لال خود بھی اردو اور فارسی کے بڑے دلدادہ تھے۔ لیکن منشی جی چاہتے تھے کہ کوئی مولوی صاحب ملیں تو انھیں کامتا پرساد کی تعلیم کے لیے مقرر کیا جائے۔ خوش قسمتی سے مولانا تصدق حسین مل گئے جو پہلے کہیں اسٹیشن ماسٹر تھے لیکن ملازمت چھوڑ کر مدرسی کا پیشہ اختیار کرلیا تھا۔ مولانا نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تعلیم دی۔ ان کی کوششوں سے کامتا پرساد کے کئی ہم وطن بھی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ بقول کامتا پرساد، یہ سلسلہ ۱۹۲۶ء تک چلتا رہا۔ مولانا اردو اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے اس لیے ان میں بھی شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوگیا۔ کامتا پرساد ابتدا میں بڑی جماعتوں میں جا کر قومی نظمیں سنایا کرتے تھے۔ خوش گلو بھی تھے۔ ۱۹۲۷ء میں بہار شریف کے ایک مڈل اسکول میں داخل کیے گئے۔

یہاں کے ہیڈ مولوی بھی شعر وسخن میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی صحبت نے کامتا پرساد کی طبیعت کو شعر و شاعری کی طرف متوجہ رکھنے میں مدد دی۔ بہار شریف میں رہتے ہوئے کامتا پرساد نے اکثر اسکول کے پروگراموں میں حصہ لیا اور آہستہ آہستہ بڑے جلسوں میں شعر کہنے کا انھیں موقع بھی ملا۔ سبقی سے ان کو گہرا

لگاؤ پیدا ہوا۔ یہاں وہ ہر دل عزیز ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں وہ کانگریسی ہو گئے اور پھر بابو راجندر پرساد پر پٹنہ میں ہونے والے مظالم پر احتجاج میں انھوں نے اپنے اسکول میں اسٹرائک کروا دی۔ اس وقت کے کانگریسی نیتاؤں سے ملاقات کی۔ طالب علموں کے مابین نمک قانون توڑنے کی تحریک چلاتے ہوئے گرفتار ہوئے پھر اپنے گاؤں واپس بھیج دیے گئے۔ یہاں آنے پر والدہ کے زیر سایہ رہنے لگے۔ پھر اسکول میں داخل کرائے گئے لیکن سوسائٹی نے برا اثر ڈالا اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ گیا چلے آئے اور ٹیوشن وغیرہ کر کے ۱۹۳۶ء میں کسی طرح میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ان کی شادی ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں وہ پرولیا چلے گئے جہاں ایک مڈل اسکول میں معلّمی کی جگہ مل گئی، کچھ دن کام کیا۔ پرولیا میں انوگرہ نرائن سنگھ سے ملاقات کر کے پھر کانگریس میں شمولیت کی درخواست کی۔ انوگرہ نرائن سنگھ نے مدد کی اور یہ جمشید پور ٹاٹا کمپنی کے ایک دفتر میں ۱۳/ نومبر ۱۹۳۸ء کو ملازم ہو گئے۔ یہاں انھیں مولوی عاشق صاحب اور مولانا احمد اللہ عشرت نیز ابوالفرح کمالی صاحب کی صحبت ملی۔ یہ حضرات اردو شعر و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی صحبت میں آنے کے بعد کامتا پرساد نے پھر شعر و شاعری میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اب مقامی مشاعروں میں شرکت بھی کرتے اور یہ سلسلہ ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ ۱۹۴۶ء میں انھوں نے ایک بڑا کوی سمّیلن کیا جو جمشید پور کی تاریخ میں بقول ان کے پہلا کوی سمّیلن تھا۔ اس مشاعرے میں ہندی کے کئی بڑے شعرا نے شرکت کی تھی۔ کامتا پرساد نے اردو شعر و ادب کی ترقی کے لیے اپنی سطح سے بہت کوششیں کیں۔ ان کا شعری سرمایہ بھی کافی تھا جو اس وقت تک محفوظ تھا، جس میں غزلیں، نظمیں، گیت اور قطعات کافی تعداد میں تھے۔

کامتا پرساد نے یہ باتیں ۲۸/ جون ۱۹۵۸ء کو تذکرہ ہندو شعرائے بہار کے مؤلف فصیح الدین بلخی کو لکھ بھیجی تھی، جو ان کی ذاتی بیاض میں محفوظ ہے۔ انھوں نے کامتا پرساد کا تذکرہ بھی اپنے تذکرے میں مختصراً کیا ہے۔ اس کے بعد کا احوال معلوم نہ ہو سکا۔

کامتا پرساد ہوش کا کلام پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اردو سے واقعی دلی محبت تھی اور وہ اردو شاعری سے بڑا سے بڑا کام لینے کے خواہشمند تھے۔ ان کی شاعری اگرچہ روایتی انداز کی شاعری ہے لیکن اسلوب بیان بڑا پُر زور اور مخصوص تیور والا نظر آتا ہے۔ چوں کہ ان کا کلام کہیں مطبوعہ صورت میں نہیں ملتا ہے لہٰذا یہاں زیادہ سے زیادہ کلام درج کیا جا رہا ہے۔

غزلیات

زندگی میں نے گزاری ہے بیاباں کے قریب
پوچھ لے جا کے کوئی خارِ مغیلاں کے قریب

کھل چکے پھول کوئی دم میں اب اُڑنے کو ہے خاک
آ کے ٹھہری ہے خزاں صحنِ گلستاں کے قریب

دست نازک کو ستم گر کے نہ دے اب تکلیف
کشتہ خود آپ پہنچ جائے نہ کنواں کے قریب

ہو چکی دولت دل صرف تن آسانی میں
اب اُڑانے کو ہے کیا خاک مری جاں کے قریب

دل صد چاک کی ہے عرض نہ باندھو جوڑا
چھوڑ دو آج پریشاں کو پریشاں کے قریب

میں تو ہوں پائے بہ زنجیر کہ ہل بھی نہ سکوں
کون پہنچے مری فریاد کو زنداں کے قریب

ہوشؔ کی کیا ہے دوا تو ہی زمانہ کہہ دے
بے حسی سے ہے پرے زیست تو نقصاں کے قریب

(۱۹۴۰ء)

جب پریم کا دیپک بجھ ہی گیا تو پیار کی آشا کون کرے
ٹوٹے ہوئے دل کے تاروں پر اب راگ اَلاپا کون کرے

رونا ہے بُرا جب دنیا میں دُکھ درد سے رشتہ کون کرے
اچھا ہے کہ دم گھٹ جائے مرا پتھر کا کلیجہ کون کرے

اک بحرِ حوادث ہے دنیا ہر سانس پہ سو سو طوفاں ہے
ایسے میں بھلا ٹکرانے کا دنیا میں ارادہ کون کرے

ناشور زباں پر ہے اب تک، فریاد گلے میں اَٹکی ہے
اس بدبختی کے عالم میں جینے کی تمنا کون کرے

یہ دنیا ڈوبی پاپوں سے ہر گام پہ چھینٹے اُڑتے ہیں
لگتے ہیں جو دھبے لگ جائیں دامن کو بچایا کون کرے

جب کالی گھٹا چھا جاتی تھی لیتا تھا سہارا بجلی کا
وہ بجلی اب خاموش سی ہے راہوں میں اُجالا کون کرے

اے ہوشؔ مدد فرما اس کی ہر بزم سخن اب مردہ ہے
جب تو نہ رہے اس محفل میں محفل کو زندہ کون کرے

وطن کے ذرّہ ذرّہ کو مہ کامل سمجھتا ہوں
میں اپنی جاں سمجھتا ہوں میں اپنا دل سمجھتا ہوں

نہالِ باغِ آزادی میں یارب پھول پھل آئے
کہ اس کو کشتہ زار زیست کا حاصل سمجھتا ہوں

جفاؤں پر یہ مرتا ہے ستم پر جان دیتا ہے
دلِ غم آشنا کو آپ کے قابل سمجھتا ہوں

ڈراتا ہے کسے اے چرخ دریائے حوادث سے
میں جانباز وطن ہوں قبر کو ساحل سمجھتا ہوں

لڑی ہے اک بت بیداد گر سے جو نظر میری
پلک کو تیر، اس کی آنکھ کو قاتل سمجھتا ہوں

مجھے آزاد پہنچائیں گے آزادی کی منزل تک
کہ میں اس رہنما کو رہبر کامل سمجھتا ہوں

گلستانِ جہاں میں داغدار اے ہوش ہے یہ بھی
نظر پڑتی ہے لالہ پر تو اپنا دل سمجھتا ہوں

(۱۹۴۰ء)

جوشِ وطن کی آگ کو ٹھنڈا نہ کیجیے
ارماں بھری حیات کو مردہ نہ کیجیے

مشعل جو جل رہی ہے محبت کی آج تک
اس کو بجھا کر آپ اندھیرا نہ کیجیے

اپنی نظر نے آپ کو دھوکے بہت دیے
اس لغزشِ نگاہ کی پوجا نہ کیجیے

ممکن ہے تن پہ آپ کے زر کا ہی ہو لباس
لیکن کسی غریب کو ننگا نہ کیجیے

سنگم یہی ہے پریم کا ملت کا ہے مقام
گنگ و جمن کے تیر کو گندا نہ کیجیے

اپنوں سے اپنے ملک کو خطرے ہیں آج بھی
جے چند ایسے دوست کو پالا نہ کیجیے

لاتا ہے اپنی قوم کو ہر طرح ہوش میں
دنیا اگر بری ہے تو پروا نہ کیجیے

(۱۹۵۵ء)

خضرِ حیات

(یہ نظم ۱۹۵۴ء میں کہی گئی)

اولے برس کے چور نہ کیوں کر دیں جسم کو
چھا جائیں کیوں نہ سر پہ مصیبت کی بدلیاں
گھِر جائیں کیوں نہ بحرِ حوادث میں ہر طرف
طغیانیِ ہزار میں ارماں کی کشتیاں
لہروں میں کھینچ سکتا ہے دریا نہیں مجھے
رہبر ہے میرا ہوش تو خطرہ نہیں مجھے

دشواریاں ہزار ہیں جیون کی راہ میں
منزل پہ جا رہا ہوں پریشانیوں کے ساتھ
ہوتی ہے میرے دل میں اندھیرے سے روشنی
شمعِ سفر ہے آج مری زندگی کے ساتھ
آجائیں لاکھ رنج تو پروا نہیں مجھے
رہبر ہے میرا ہوشؔ تو خطرہ نہیں مجھے

جینے کی آرزو کو حقیقت بناؤں گا
سر میں ہے میرے جمع وہ سودائے نوجواں
مرنیکے بعد پھر بھی یقیں ہے کہ ساتھ ساتھ
منزل نما بنے گا مرے خون کا نشاں
مردوں کی طرح آتا ہے جینا نہیں مجھے
رہبر ہے میرا ہوشؔ تو خطرہ نہیں مجھے

کھولوں گا نوکِ فن سے ہر اک عقدۂ حیات

زلف سخن سنوار رہا ہوں میں دیر سے
شعلے ہیں شعر شعر میں میرے بھرے ہوئے
اک پیکر شرار رہا ہوں میں دیر سے

شبنم کی طرح آتا ہے رونا نہیں مجھے
رہبر ہے میرا ہوشؔ تو خطرہ نہیں مجھے

جوشؔ ملیح آبادی نے کامتا پرساد ہوشؔ کو ایک ملاقات میں یہ پیغام دیا تھا کہ:

بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

اور اس کے بعد کامتا پرساد اس کوشش میں لگے اور اپنی زندگی کا مقصد اس شعر کو بنا لیا:

سمجھوں گا زندگی بھی ہوئی ہوشؔ کارگر
گر میں وطن کو ہوش میں لا کر چلا گیا

قطعات

میں نے جنتا سے لَو لگائی ہے — اپنے جینے کی راہ پائی ہے
کوئی لوٹے نہ اس خزانے کو — زندگی کی یہی کمائی ہے

گڑگڑانا مجھے نہیں بھاتا — غم میں رونا مجھے نہیں آتا
زندگی ہوشؔ مجھ کو پیاری ہے — موت کا گیت میں نہیں گاتا

آج ہر شے بڑی سہانی ہے — آج ذرّوں میں بھی جوانی ہے
جھک گئی موت ان کی قدموں پر — جن کے سینے میں زندگانی ہے

روک مجھ کو نہ پاس آنے دے — سنکٹوں سے نظر ملانے دے

ہوں اندھیرے میں ایک مدت سے　　آج گھر میں دِیا جلانے دے

میری راہوں پہ آ نہیں سکتا　　میرے دل کو ہلا نہیں سکتا
مشعل زندگی ہے ہاتھوں میں　　اس کو طوفاں بجھا نہیں سکتا

پریم کا ساز میں بجاتا ہوں　　گیت جیون کا روز گاتا ہوں
اپنی ہستی پہ ناز ہے مجھ کو　　پاس اس کو سدا بلاتا ہوں

میں قسمت مزدور بنا دیتا ہوں　　زردار کی ہستی کو مٹا دیتا ہوں
قدموں پہ غریبی کے میں اکثر اے ہوشؔ　　پیشانیِ دولت کو جھکا دیتا ہوں
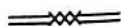
حواشی

(۱) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۴۲- ۱۴۷۔
(۲) ہندو شعرا، ص ۱۳۰؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۶۔
(۳) حیات دوام، ص ۲۷-۲۹۔
(۴) آرا ایک شہر سخن، ص ۲۶۳۔
(۵) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۸۔
(۶) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۱-۱۱۳۔
(۷) آرا ایک شہر سخن، ص ۴۸۲۔
(۸) روزنامہ فاروقی تنظیم، رانچی، ۱۵/نومبر ۲۰۰۸ء، ڈاکٹر منظر حسین، رانچی۔
(۹) آرا ایک شہر سخن، ص ۳۱۶۔
(۱۰) سخنورانِ سارن، ص ۲۲-۲۳۔
(۱۱) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۶۲۔
(۱۲) آرا ایک شہر سخن، ص ۲۶۱۔
(۱۳) ہندو شعرا، ص ۱۴۸؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۶۳۔
(۱۴) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۶۳۔
(۱۵) ہندو شعرا، ص ۱۳۲۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۶۳؛ بزم شمال، ص ۲۵۰۔
(۱۶) آرا ایک شہر سخن، ص ۴۸۴۔
(۱۷) گلہائے چمپا، ظفر مجیبی، ۲۰۰۵ء۔
(۱۸) ہندو شعرا، ص ۱۳۴؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۳۔
(۱۹) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۵۔

(۲۰) بزم شمال، ص۲۱۴ ؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۱۲۲۔

(۲۱) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۶۔

(۲۲) سخن ورانِ سارن، ص۱۴۶۔

(۲۳) آرا ایک شہر سخن، ص ۳۱۸۔

(۲۴) ایضاً، ص ۵۳-۲۵۲۔

(۲۵) ماہنامہ تاج، گیا، مارچ ۱۹۲۲ء، ص ۹۸۔

(۲۶) ماہنامہ تاج، گیا، اپریل ۱۹۲۲ء، ص ۱۲۶۔

(۲۷) ماہنامہ تاج، گیا، مئی ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۱۔

(۲۸) ماہنامہ تاج، گیا، جون ۱۹۲۲ء، ص ۱۹۴۔

(۲۹) ماہنامہ تاج، گیا، اکتوبر ۱۹۲۳ء، ص ۹۰۔

(۳۰) ایضاً، ص ۱۰۴۔

(۳۱) ماہنامہ تاج، گیا، فروری، مارچ ۱۹۲۲ء، ص ۸۶۔

(۳۲) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص۱۳۲۔

(۳۳) ہندو شعرا، ص ۵۶ ؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۶۔

(۳۴) ماہنامہ تاج، گیا، مئی ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۴۔

(۳۵) ماہنامہ تاج، گیا، اگست ۱۹۲۲ء، ص ۶۰۔

(۳۶) حیاتِ دوام، ص ۱۲۰، ۱۳۱ ؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۸۔

(۳۷) تاریخ شعرائے بہار (قلمی مسودہ) حصہ دوم ؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۸۔

(۳۸) ڈاکٹر محمد ناصر رضا خاں جلالی : آزادی کے بعد اردو کے ممتاز ہندو شعرا، نظم نگار، مطبوعہ جولائی ۲۰۰۸ء

(۳۹) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۵۴ - ۱۶۱۔

(۴۰) گلہائے چمپا، ظفر مجیبی، ص ۱۱۳۔

(۴۱) ایضاً، ص ۱۳۶۔

(۴۲) ایضاً، ص ۱۶۱-۱۶۲۔

(۴۳) تاریخ شعرائے بہار، حصہ دوم (قلمی مسودہ)؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۴۷۔

(۴۴) ہندو شعراء، ص ۴۷؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۶۲۔

(۴۵) سخنورانِ سارن، ص ۵۲-۵۵۔

(۴۶) گلہائے چمپا، ظفر مجیبی، ص ۲۷، سالِ اشاعت ۲۰۰۵ء۔

(۴۷) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۶۴-۱۶۷۔

(۴۸) ہندو شعرا، ص ۱۵۰۔

(۴۹) بزم شمال، ص ۱۸۹۔

(۵۰) آرا: ایک شہر سخن، ص ۳۱۶۔

(۵۱) ہندو شعرا، ص ۹۰؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۷۔

(۵۲) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۳-۱۲۴۔

(۵۳) تاریخ شعرائے بہار، حصہ دوم (قلمی مسودہ)؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۱۔

(۵۴) ماہنامہ تاج، گیا، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۸۹-۹۰۔

(۵۵) ماہنامہ تاج، گیا، جنوری ۱۹۲۳ء، کانگریس نمبر، ص ۳۷-۳۸۔

(۵۶) آرا: ایک شہر سخن، ص ۳۲۶۔

(۵۷) گلشن حیات، ص ۱۱۸-۱۱۹۔

(۵۸) حقیقت بھی کہانی بھی، بدر عظیم آبادی، ص ۵۳۷۔ بدر عظیم آبادی نے ہر جگہ ان کا نام رائے ایشوری پرساد لکھا ہے۔ لیکن ان کے ہم عصر قیس رضوی نے جو نام لکھا ہے اسے ہی ترجیح دی گئی ہے۔

(۵۹) حقیقت بھی کہانی بھی، ص ۵۳۷۔

(۶۰) ہندو شعرا، ص ۹۶۔

(۶۱) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۰۷، ۱۰۸۔

(۶۲) ہندو شعرا، ص ۹۸؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۶۳۔

(۶۳) آرا: ایک شہر سخن، ص ۳۴۸۔

(۶۴) تاریخ شعرائے بہار، راز بلخی عظیم آبادی، حصہ دوم (مسودہ قلمی)؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۹۔

(۶۵) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۸۔

(۶۶) ہندو شعرا، ص ۱۰۰؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۱۔

(۶۷) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۵۔

(۶۸) ہندو شعرا، ص ۱۴۰؛ حیاتِ دوام ص ۱۵۶-۱۵۷ ؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۸ - ۱۲۰۔

(۶۹) تاریخ شعرائے بہار، حصہ دوم (قلمی مسودہ) ؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۱۔

(۷۰) ہندو شعرا، ص ۱۰۳۔

(۷۱) حیاتِ دوام، ص ۱۵۸- ۱۵۹؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۳۱۔

(۷۲) ماہنامہ تاج گیا، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۹۰۔

(۷۳) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۳۰۔

(۷۴) تاریخ شعرائے بہار (قلمی مسودہ)، حصہ دوم ؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۹۔

(۷۵) ہندو شعرا، ص ۱۰۵ ؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۰۔

(۷۶) سخنوران سارن، ص ۱۳۰ -۱۳۱۔

(۷۷) حیات دوام، ۹۸--۱۰۰۔

(۷۸) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۹۔

(۷۹) گلہائے چمپا، ظفر مجیبی، ص ۳۷۔

(۸۰) ماہنامہ تاج گیا، جنوری ۱۹۲۱ء، ص ۳۱ ؛ بزم شمال، ص ۲۲۶ ؛ تذکرہ ہندو شعرائے

بہار، ص ۱۰۸۔

(۸۱) ماہنامہ تاج گیا، اپریل ۱۹۲۰ء، ص ۱۶۱۔

(۸۲) ماہنامہ تاج گیا، مارچ ۱۹۲۰ء، ص ۱۲۸۔

(۸۳) بہار میں اردو طنز و ظرافت، ص ۴۸۔

(۸۴) آرا: ایک شہرِ سخن، ص ۴۲۸۔

(۸۵) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۶۔

(۸۶) آرا: ایک شہرِ سخن، ص ۴۸۳۔

(۸۷) ہندو شعرا، ص ۱۱۵؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۲۔

(۸۸) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۴۸۔

(۸۹) تاریخ شعرائے بہار، حصہ دوم (قلمی مسودہ)؛ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۲۲۔

(۹۰) نھونی لال وحشیؔ مظفر پوری کی مرثیہ گوئی کے بارے میں رجوع کریں: تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ. ڈی. ''بہار میں اردو مرثیہ نگاری'' از ڈاکٹر سید حسن عباس، ۱۹۸۸ء۔

(۹۱) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۱۶۔

(۹۲) حیاتِ دوام، ص ۱۱۳-۱۱۵۔

(۹۳) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۰۰۔

(۹۴) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۳۷-۱۴۲۔
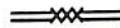
باب دوم

بہار کے اہم ہندو شعرا کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

⦿

بہار کی اردو شاعری کی روایت کو استحکام بخشنے والے یوں تو ہندو شعرا کی تعداد کافی ہے لیکن ان میں چند ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو دل سے قبول کیا اور اپنے ما فی الضمیر کی ادائیگی کا وسیلہ قرار دیا۔ ایسے شعرا میں چند کے بارے میں تفصیلی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش اس باب میں کی گئی ہے۔

لالہ اُجاگر چند اُلفتؔ

عظیم آبادی شعرائے ہنود میں لالہ اُجاگر چند اُلفتؔ اردو اور فارسی گو شاعر گزرے ہیں، جن کا تفصیلی ذکر متقدمین شعرا کے تذکرے میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں ان کی دستیاب ایک غزل کا تحلیل و تجزیہ پیش کر کے ان کے افکار کی پیشکش کے طرز پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ جیسا کہ آغاز کلام میں عرض کیا جا چکا ہے کہ الفتؔ کی پندرہ اشعار کی ایک غزل پروفیسر حسن عسکری صاحب کے توسط سے دستیاب ہوئی تھی، جس کے آٹھ اشعار پروفیسر اختر اورینوی نے اپنی کتاب ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا'' (ص ۲۲۵) پر نقل کیے ہیں۔ جب کہ فصیح الدین بلخی صاحب نے اپنی کتاب ''تذکرہ ہندو شعرائے بہار'' (ص ۱۱) میں پوری غزل درج کی ہے البتہ بعض اشعار میں کچھ الفاظ پڑھے نہ جانے یا کاغذ کی بوسیدگی کے سبب چھوڑ دیئے ہیں۔ غزل یہ ہے:

خلوت نشینِ غم کو تماشا سیں کام کیا　　　مخمور جام عشق کو صہبا سیں کام کیا
دیوانۂ محبتِ بے اختیار کون　　　تکلیف حال صحبت دانا سیں کام کیا

مستِ مئے الست کو ہے تشنۂ دگر — جام شراب کہنہ و مینا سیں کام کیا
آباد باد ملک قناعت و مردمی — ویرانۂ خرابیٔ دنیا سیں کام کیا
جس کو ہے زر و ہمت بازوئے مردمی — اِرث پدر و خانۂ بابا سیں کام کیا
آنرا کہ ہست قفل خموشی بہ باب لب — چون و چرائے ..... سیں کام کیا
صاحب سخن سوں صحبت جاہل ..... — سلک ..... و گوہر یکتا سیں کام کیا
پروردہ آفتاب محبت کو روزِ حشر — باغ نعیم و سایۂ طوبیٰ سیں کام کیا
جس کو ہے داغ سینہ و آتش تمام دل — سیر گل و مفرح لالہ سیں کام کیا
لیتا متاع دل کا کفِ اختیار سوں — سودائے عشق و بے سر و سودا سیں کام کیا
جس کو تپ جدائی ہی کا مرض دل میں ہے — ناز طبیب و تاب مداوا سیں کام کیا
ترک وجود درس محبت کا ابتدا — بے مسئلہ یہ صحبت ملاّ سیں کام کیا
جائیکہ بوریائے نشیناں قدم نہند — فرش سمور و بستر دیبا سیں کام کیا
حاکم بیاد ارنس ..... شاہ ملکِ دل — ملک شہ سکندر و دارا سیں کام کیا

یارب غریبؔ ملک معانی کو رہ نما
شکل مہیب وصورت زیبا سیں کام کیا

لالہ اُجاگر چند اُلفت پہلے غریبؔ تخلص کرتے تھے اور اس غزل میں بھی انھوں نے یہی تخلص استعمال کیا ہے۔ وہ فارسی کے اچھے شاعر اور نثر نگار بھی تھے۔ اس لیے اس غزل میں فارسی الفاظ کا پورا پورا استعمال ملتا ہے۔ اس غزل کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ الفت نے روایتی قسم کی شاعری کی ہے۔ عشق میں مبتلا شخص کے لیے سوائے وصل معشوق کے دوسرا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اگر اسے کائنات کی بادشاہت بھی دے دی جائے تو وہ بادشاہت کے مقابلے میں اپنے عشق اور وصل معشوق کو ہی ترجیح دے گا اور تاریخ میں ایسے عاشقوں کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے عشق میں عشق میں گھر بار چھوڑ کر صحرا کی راہ لی اور معشوق کے وصال کی تمنا کرتے

رہے۔ شیریں فرہاد، خسرو شیریں، ہیر رانجھا، سسی پنوں، لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے قصے یہی بتاتے ہیں۔

الفتؔ نے بھی اپنی مذکورہ غزل میں اسی چیز پر زور دیا ہے اور مختلف الفاظ اور اصطلاحات کے استعمال کے ذریعہ اسی بات کو ظاہر کیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ الفت بنیادی طور پر فارسی گو تھے پھر اردو بھی اتنی صاف نہیں ہوتی تھی جتنی کہ آج ہے۔ اس زمانے میں اس پر عربی، فارسی اور مقامی زبانوں کے اثرات حاوی تھے۔ اس لحاظ سے الفت کی یہ غزل کافی صاف اور رواں ہے۔ اور نفس مطلب کی پیش کش بھی بخوبی ہوئی ہے۔

شیام کشور سری واستو، شامؔ عنایت پوری

شامؔ عنایت پوری بھی ان شعرا میں ایک ہیں جنھوں نے عربی، فارسی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اِن زبانوں میں شعر گوئی کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ فارسی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے انھوں نے فارسی میں ایم. اے. کیا تھا۔ اگرچہ وکالت کا پیشہ اختیار کیا، لیکن ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کے وہ نمائندہ تھے اور اپنی شاعری کے ذریعے قدیم روایات اور انسانی اقدار کی پاسداری میں سرگرم و منہمک بھی۔

شامؔ عنایت پوری فارسی میں صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔ باوجود کوشش بسیار ان کا دیوان دستیاب نہیں ہو سکا۔ فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شاعری کرتے تھے۔ ان کی دو غزلیں اور ایک نظم ''سخنورانِ سارن'' (ص۵۲-۵۴) پر ملتی ہے۔ غزلوں میں ان کا انداز اردو کی مروجہ روایتی شاعری کا سا ہے، جن میں عشق و عاشقی کی باتیں ملتی ہیں لیکن انداز و اسلوب بہت معنی خیز ہے۔ جیسے کسی سے گفتگو میں

مصروف ہیں۔

یہ لے، جاں ہے اپنی، یہ ایمان اپنا
چڑھاوے کا تیرے ہے سامان اپنا

محبت محبت محبت محبت
یہ مصرع ہے گویا کہ دیوان اپنا

''محبت'' ان کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے اور سچائی یہ ہے کہ اردو کی غزلیہ شاعری کی جو روایت زمانۂ قدیم سے ملتی ہے اس میں محبت و عشق کو طرح طرح سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ معشوق کی بے اعتنائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یوں ہی خوں کرو گے تو دھبّوں سے خوں کے
بچاؤ گے کب تک گریبان اپنا

''مہمان'' چاہے معشوق ہو چاہے کوئی اور۔ ہماری ہندوستانی روایت رہی ہے کہ مہمانوں کو ہمارے ملک میں بہت احترام حاصل ہے۔ حتیٰ دشمن بھی اگر مہمان ہو جاتا ہے تو اس کی خاطر خواہ پذیرائی میں کوئی کسر نہیں اٹھائی جاتی اور اگر فضل خدا سے کہیں معشوق کی میزبانی کا موقع مل جائے تو کیا کہنے۔ شاعر اسی پس منظر میں کہتا ہے:

عوض گل کے بستر پہ آنکھیں بچھیں گی
ذرا اُن کو ہونے دو مہمان اپنا

شآم کی یہ غزل سہل ممتنع میں ہے۔ اس میں انھوں نے عشق و محبت کو ہی مرکزی نقطہ قرار دیا ہے۔ لیکن دوسری غزل پر جس کا مطلع یہ ہے:

قیصری فغفوری اپنے گھر کی ویرانی ہوئی
کیسی ساسانی ہوئی اے عشق خاقانی ہوئی

پوری طرح فارسیت غالب ہے۔ نہ صرف فارسیت غالب ہے بلکہ فارسی زبان اور

ادب کے تاریخی پس منظر میں یہ غزل کہی گئی ہے، جس میں ایسے الفاظ و اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے، جن کی تشریح وتفسیر، تفصیل طلب ہے۔

قیصری، فغفوری، ساسانی اور خاقانی جیسے الفاظ ایک ہی شعر میں استعمال کر کے شاعر نے اپنے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

ان کی نظم کا عنوان ''غالب'' ہے۔ شاعر نے اس نظم میں اردو کے مایۂ ناز شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ نظم بھی غالب کے انداز میں کہی ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے شاعر کی وسعت معلومات اور سخن گوئی کا اسلوب نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ نظم فارسی میں ہے۔

شاؔم عنایت پوری نے غالب کی وفات پر یہ نظم کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تو نے تو جنت میں گھر بسا لیا اور اپنے چاہنے والوں کو روتا بلکتا چھوڑ دیا۔ تو خالق دنیائے معنی تھا اور تیری ذات ہفت اقلیم اور باغ وطن کے لیے مایۂ ناز تخیل کی وادی میں تو شیر نیستاں ہے اور گلستانِ تخیل میں سرو کی مانند۔

غرض پوری نظم میں شاعر نے مرزا غالب کے کمالات کا اعتراف کیا ہے اور آخر میں پروردگار سے دعا کی ہے کہ غالب کے شعروں کی قدر و منزلت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے۔ میری (شاعر کی) تجھ سے صبح و مسا یہی دعا ہے۔

منشی بہاری لال فطرتؔ

شمالی بہار کی سربرآوردہ شخصیات میں منشی بہاری لال فطرتؔ دربھنگوی بحیثیت شاعر اور نثر نویس نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ منشی بہاری لال فطرت کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ تحصیل علم کے شوق نے انھیں تمام رائج علوم کی تعلیم حاصل کرنے میں مدد پہنچائی اور انھوں نے علم صرف و علم نحو کی تعلیم حاصل کرنے کے

ساتھ فارسی نثر و نظم کی کتابیں پڑھ کر اردو اور فارسی میں مہارت حاصل کی۔ انگریزی کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کی اور ۱۹۵۶ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور سرکاری وکیل ہوئے۔

شاعری میں اس وقت کے بزرگ اور باکمال شاعر مرشد حسن کامل دھرمپوری کے شاگرد ہوئے جو خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ فطرتؔ صاحب دیوان تھے اور نثر میں ان کی ایک تالیف ''آئینۂ ترہت'' ہے جو ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس علاقے کی تاریخ، ثقافت اور شعر و ادب پر مشتمل معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ ان کا دیوان شائع نہیں ہو سکا۔

ان کی چند غزلیں اور ایک قصیدہ ''تذکرہ بزم شمال'' میں اور ایک غزل تذکرہ ہندو شعرائے بہار میں نقل ہوئی ہے۔ یوں ان کا یہ کلام ''آئینۂ ترہت'' سے ہی ماخوذ ہے۔

فطرتؔ کی غزلوں میں حسن و عشق کا بیان بڑے شاعرانہ انداز میں ہوا ہے۔ ایک غزل کا مطلع ملاحظہ کیجیے:

روئے تاباں کو جو دیکھا بولے قامت دیکھیے
آفتاب حشر تو دیکھا قیامت دیکھیے

اسی طرح ایک اور شعر میں مشہور محاورہ ''منہ دھو کر آنا'' کا استعمال بڑے برجستہ انداز میں کیا ہے:

بوسۂ رخسار مانگا تو یہ فرمانے لگے
جا کے منہ دھو آیئے اور اپنی رویت دیکھیے

حسن کے آگے عشق کا بس نہیں چلتا ہے۔ شاعر نے ایک شعر میں خود سپردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حسن کی برتری تسلیم کی ہے۔

اس طرف تیغ آزمائی ہے میں نے گردن ادھر جھکائی ہے

اس طرف عجز و جبہ سائی ہے اس طرف ناز کبریائی ہے

فطرتؔ کی غزلوں میں بھی وہ عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں جو ہماری روایتی شاعری کا مزاج کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے صاف و سادہ مگر تغزل سے بھرپور اشعار میں اپنے دلی احساسات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔ زبان و بیان بھی قابل ملاحظہ حد تک دل نشیں ہے۔

مٹا لو حسرت دیدار چل کے اے فطرتؔ
سنا ہے آج کل دیدار عام ہوتا ہے

دل میں، جگر میں، سینہ میں، پہلو میں درد ہے
اے چارہ گر بتا کہ بتاؤں کہاں کہاں

گوہر کی طرح نکلے باہر تو آبرو ہو
ہوتی نہیں ہے عزت انسان کی وطن میں

مؤخر الذکر شعر حقیقت پر مبنی ہے۔ کوئی کتنا ہی صاحب کمال کیوں نہ ہو اسے اپنے گھر یا اپنے وطن میں کوئی عزت و احترام حاصل نہیں ہوتا۔ فطرتؔ نے اسی بات کو شعر کا جامہ پہنا کر ایک اٹل حقیقت کو شاعرانہ روپ عطا کیا ہے۔ یہی بات کسی اور شاعر نے بھی کہی ہے۔

سر پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

قصیدہ گوئی میں بھی فطرتؔ کو دخل تھا۔ انھوں نے ریاست دربھنگہ کے مہاراجہ لچھمیشور سنگھ کی مدح میں جو طویل قصیدہ کہا ہے اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فطرت کو فن قصیدہ کے تمام نکات پر عبور حاصل تھا۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:

جمال گل ترقی پر ہے بلبل ہے مسرت میں

چمن میں فیض بہار باغ سے ہے جوش مرہت میں

۲۵ اشعار کے اس قصیدے میں فطرت نے مہاراجہ کی مدح کی ہے۔ ان کی رعیت پروری، مسکین نوازی، ہمدردی، مروّت، سخاوت، شجاعت اور شرافت کا بیان دل آویز انداز میں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

رعیت پروری، مسکیں نوازی ہے طبیعت میں
طبیعت دردمنداں ذات والا ہے حقیقت میں

رحیم ایسے کہ جب حاضر ہوا دشمن تواضع سے
مثال دوست اس کو لے لیا دامانِ شفقت میں

رئیس ایسے کہ مجرم پر بھی غصہ تک نہیں آتا
اگر آتا ہے رہ جاتا ہے آغوشِ مروّت میں

نہیں کا لفظ بھولے سے بھی ہونٹوں پر نہیں آتا
طلب جس نے کیا جو کچھ دیا جوشِ سخاوت میں

قصیدے کے لیے شوکت الفاظ کی شرط لازمی ہے۔ فطرت نے بھی اس پہلو پر دھیان مرکوز رکھا ہے۔ اس طرح بحثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ منشی بہاری لال فطرت کی شاعری صاف ستھری اور پاکیزہ شاعری ہے ان کے خیالات و افکار بہت سلجھے اور صاف ہیں۔ زبان و بیان میں بھی سادگی اور صفائی کے عناصر ملتے ہیں۔

منشی اٹل بہاری اسیر دربھنگوی

بڑے وضعدار آدمی تھے۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ بقول شاداںؔ فاروقی :

''کسی ناگزیر حالات کی بنا پر اسیری کے دن دیکھے اور کلکتہ بھیج دیے گئے، جہاں انھیں ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء سے ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۳ء تک صعوبتیں جھلینا پڑیں۔ یوں تو پہلے ہی سے شعر کہتے تھے لیکن ان کی حفاظت کا کبھی التزام نہیں کیا۔ زنداں سے چھوٹے تو کلام کو جمع کرنا شروع کیا۔ اپنے تمام کلام ایک جا کر کے ''دیوان اسیر مسلسل'' اس کا نام رکھا اور اپنے ہاتھ سے خوش خط لکھ کر اسے ۱۹۱۵ء میں تکمیل تک پہنچا کر داعیِ اجل کو لبیک کہا''(۱)۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بنا کر یہ زلفیں کدھر جایئے گا
سمجھتے ہیں ہم بھی جدھر جایئے گا

محبت میں ایمان ہم کھو کے بیٹھے دل و جاں سے ہیں ہاتھ ہم دھو کے بیٹھے

اسیر محبت کو بھولو نہ اپنے کہ عالم سے رسوا ہیں ہم ہو کے بیٹھے

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے غضب ہے گل سے کیوں بلبل جدا ہے
کسی پر دل نہیں گر آ گیا ہے تمھارا زرد چہرہ کیوں ہوا ہے
اسیر اچھا کیا منہ اس سے موڑا یہی ان بے وفاؤں کی سزا ہے

اسیرؔ کی غزلوں میں بھی عشقیہ پہلو جلوہ گر ہے جو زمانے کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ زبان بہت صاف اور سادہ ہے۔ روانی اور سلاست بھی ملتی ہے۔ افسوس کہ اسیرؔ کا دیوان زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا۔

بابو اودھ بہاری سنگھ بیدلؔ مظفر پوری

بیدلؔ مظفر پوری کو اردو، فارسی زبانوں کے علاوہ ہندی، سنسکرت، مراٹھی، انگریزی اور گجراتی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ علم طب سے بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے۔ فارسی شاعری میں آغا کمال الدین مرزا عبد العطوف سنجر تہرانی کے شاگرد تھے۔ اردو میں کس سے مشورۂ سخن کرتے تھے، معلوم نہ ہو سکا۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اگر اپنے دل پہ ظالم ہمیں اختیار ہوتا
نہ یہ جاں کنی ہی ہوتی نہ یہ انتظار ہوتا
مرا تیر آہ گرچہ ہے فلک رسا و لیکن
اسے کارگر سمجھتے جو جگر کے پار ہوتا
ترا حسن اس جہاں میں جو نہ ہوتا پَرتو افگن
نہ یہ پھول دل لبھاتے نہ یہ سبزہ زار ہوتا
نہ یہ آبشار ہوتا نہ یہ برف مسکراتی
نہ یہ پتھر آہ کرتے، نہ کہیں شرار ہوتا

دس اشعار پر مشتمل یہ غزل مرزا غالب کی مشہور غزل:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

کی زمین میں ہے اور بہت خوشگوار لب ولہجہ کی حامل ہے۔ بیدلؔ مظفر پوری کی شاعری میں خوبصورت تشبیہات اور دل پذیر تراکیب بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انداز بیان صاف و سادہ ہے اور کہیں بھی گنجلک پن نہیں دکھائی دیتا۔

رام پرساد کھوسلا ناشاؔد

ناشاؔد کا تعلق اگر چہ پنجاب سے ہے لیکن انھوں نے سرزمین بہار کو اپنی مستقل سکونت گاہ بنا لیا تھا اور مظفر پور کے معروف کالج لنگٹ سنگھ کالج میں پہلے وائس پرنسپل اور پھر پرنسپلی کی حیثیت سے کام کیا۔ کچھ دنوں ٹی. این. بی. کالج بھاگلپور اور بی. این. کالج پٹنہ کے بھی پرنسپل رہے۔ لیکن وہ مظفر پور آ گئے اور یہیں سے ملازمت سے سبکدوش بھی ہوئے۔

رام پرساد کھوسلا ناشاؔد بہت صوفی منش انسان تھے۔ لوگوں کے ساتھ مروّت و ہمدردی سے پیش آنا ان کا شیوہ تھا۔ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ ضرورت مندوں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ وہ دردمند دل کے مالک تھے لہٰذا شاعری سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی اور بقول شاداں فاروقی :

> ''ان کی شاعری حدیث دلبراں ہونے کے ساتھ حدیث دیگراں بھی تھی''(۲)۔

اور سید محمود کے بقول :

> ''ناشاؔد کے کلام میں وہ سب کچھ ہے جو عہد حاضر کے مستند، مشہور و مقبول شعرا کے کلام میں پایا جا سکتا ہے۔ اصغؔر کا تصوف، فاؔنی کی قنوطیت، اقباؔل کی لَے احساؔن کی بیکسی، جوؔش کی وطن پرستی اور ان تمام اسالیب میں ادا و آثار کے ساتھ ناشاؔد کی انفرادیت بھی اُبھرتی ہے''(۳)۔

ناشاؔد نے غزل اور نظم میں اپنے گوناگوں افکار پیش کیے ہیں۔ انھوں نے غزلوں سے زیادہ اپنے احساسات و افکار کی ترجمانی کے لیے نظم کا انتخاب کیا اور اسی قالب میں شاعری کے نمونے پیش کیے۔ وہ فطری شاعری کے حامی تھے، جس کی تحریک مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حاؔلی نے شروع کی تھی۔ ناشاؔد کی نظموں میں بان گنگا،

توئی ندی، ٹہری گڑھوال، اُجڑا دیار، شالیمار باغ، دیوالی کی رات، ڈل جھیل، درّہ، نخل چنار وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جن میں مناظر قدرت کی بخوبی عکاسی کی گئی ہے ان میں سے کئی نظمیں منظری شاعری کی خوبصورت مثال بھی بن سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ برگ خشک، بہتا پانی، خار گلشن، خزاں، قوس قزح، اداسی، گل پژمردہ، مالن او جی چاہتا ہے وغیرہ نظموں میں عرفان وتصوف کی چاشنی ملتی ہے۔ بقول شاداں فاروقی:

"وہ کہیں ورڈز ورتھ کی طرح فطرت کی نقاشی کرتے ہیں
تو کہیں رومیؔ و عراقی کی طرح مظاہر فطرت کے جلووں میں ڈوب
جانے کے آرزومند ہیں" (۴)۔

ایک مجموعۂ کلام "نالۂ ناشاد" پٹنہ سے شائع ہوا تھا، جو دستیاب ہے۔
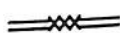
کامتا پرساد ہوشؔ

اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی میں اچھی استعداد کے مالک تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ہوشؔ نے کانگریس کی تحریک سے متاثر ہوکر تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا اور کانگریس کی تحریکوں میں پیش پیش رہنے لگے۔ قانون شکنی کے الزام میں کئی بار قید و بند سے بھی دوچار ہوئے لیکن ان کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی۔ آخرکار معاشی مجبوریوں نے انھیں ٹاٹا کمپنی میں ملازم ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہوشؔ کو اردو شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے جمشید پور کے قیام کے دوران شعرا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی اور کئی بڑے بڑے مشاعرے کیے۔ انھوں نے غزل، قطعہ، رباعی اور نظم کے علاوہ گیت بھی کافی مقدار میں لکھے۔ ان کی شاعری میں ہندی کے عام اور مانوس الفاظ کا کثرت سے استعمال ملتا ہے۔ ایک گیت میں کہتے ہیں:

جاگ اٹھی ہے جنتا ساری

جھوم رہی ہے ڈالی ڈالی کلیوں میں اِک جوش بھرا ہے
مست پرندے ناچ رہے ہیں آج قفس کا دوار کھلا ہے
چلتی ہے اب بادِ بہاری
جاگ اٹھی ہے جنتا ساری
منہ اُترا ہے زرداروں کا محلوں میں اِک شور مچا ہے
ظلمت خوف سے کانپ رہی ہے ایک نیا سورج نکلا ہے
ہوش میں آئے نَر ناری
جاگ اٹھی ہے جنتا ساری

کامتا پرساد ہوشؔ نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف پُرزور آواز اٹھائی ہے۔ ملک اور وطن کے لیے ان کا جذبہ نہایت قابل تحسین ہے۔ ایک بار شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی نے ہوشؔ کو مشورہ دیا تھا کہ:

بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

اس مشورے کے بعد ہوشؔ نے قوم کو بیدار کرنے اور ہر مشکل گھڑی کو ہنس کر گزار لینے کی روش اختیار کی۔

میں نے جنتا سے لَو لگائی ہے اپنے جینے کی راہ پائی ہے
کوئی لوٹے نہ اس خزانے کو زندگی کی یہی کمائی ہے

گڑگڑانا مجھے نہیں بھاتا غم میں رونا مجھے نہیں آتا
زندگی ہوشؔ مجھ کو پیاری ہے موت کا گیت میں نہیں گاتا

ہوشؔ نے کئی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں دورِ انقلاب، خضر حیات، اعلان، لوہے کا شہر (جمشید پور) فنکار کی آواز، نئے منصوبے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نظم ہو یا

غزل۔ ہر میدان میں ہوش نے اپنے دلی جذبات و احساسات کی خوبصورت ترجمانی کی ہے۔ گیتوں میں بھی ان کا رویہ ایسا ہی ہے لوگوں کو ملک کی خدمت کے لیے اُبھارنا، قومی یکجہتی بنائے رکھنا، اتحاد کو بڑھاوا دینا، اپنے ملک کی ہر شے سے پیار کرنا، غریبوں اور مزدوروں سے ہمدردی سے پیش آنا جیسے نکات ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

ہوش کی شاعری قومی شاعری کا خوبصورت نمونہ ہے۔ زبان و بیان میں سادگی اور روانی بھی پائی جاتی ہے۔ عام فہم الفاظ کا استعمال ان کا طرۂ امتیاز ہے البتہ کثرت شعر گوئی کے باعث بعض اوقات کلام میں توازن کی کمی بھی پائی جاتی ہے، جس سے صرفِ نظر کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ہوشؔ کو ہی اپنا رہبر بنایا ہے۔

رہبر ہے میرا ہوش تو خطرہ نہیں مجھے

اولے برس کے چور نہ کیوں کر دیں جسم کو
چھا جائیں کیوں نہ سر پہ مصیبت کی بدلیاں
گھِر جائیں کیوں نہ بحرِ حوادث میں ہر طرف
طغیانیِ ہزار میں ارماں کی کشتیاں

لہروں میں کھینچ سکتا ہے دریا نہیں مجھے
رہبر ہے میرا ہوش تو خطرہ نہیں مجھے

بہار کے ہندو شعرا نے اردو شاعری کے گونا گوں موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے ان میں طنز و مزاح بھی ایک ہے۔ حکیم پچھمن پرساد مچھر داناپوری ماضی میں اور حال حاضر میں سنیل کمار تنگؔ عنایت پوری ایسے قابل ذکر ہندو طنزیہ و مزاحیہ شاعر ہیں جن کی شرکت کے بغیر کوئی مشاعرہ کامیاب مشاعرہ نہیں ہوتا۔ سنیل کمار تنگؔ عنایت پوری مشاعرہ پڑھنے کے اپنے مخصوص انداز سے سامعین کا دل جیت لیتے ہیں س۔ انھوں نے ملک کے سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اگر چہ ان کی

شاعری ۱۹۸۰ء کے بعد کے دہے میں پروان چڑھی ہے لیکن انھوں نے مختصر سے عرصے میں ہی ملک کے گوشہ و کنار بلکہ بین الاقوامی سطح پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ چند نمونے تفنن طبع کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

وفا کو میں جفا لکھوں جفا کو میں وفا لکھوں
سلگتی دھوپ کی کرنوں کو ساون کی گھٹا لکھوں

مری مجبوریوں کو تو جو چمچہ نام دیتا ہے
بتا اس دور میں میں یہ نہیں لکھوں تو کیا لکھوں

وفاداری نبھانے میں اداکاری نہیں کرتا
وہ احمق ہے جو غداروں سے غداری نہیں کرتا

وفاداری کا یہ عالم کہ سب کتا سمجھتے ہیں
یہی سب سوچ کر میں بھی وفاداری نہیں کرتا

البتہ طنزیہ اور ظریفانہ شاعری تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ شاعر کو سنبھل کر چلنا ہوگا اور ٹھوس و پائیدار مواد کی پیش کش کی فکر کرنا ہوگی ورنہ یہ عارضی اور وقتی مواد کی پیش کش وقت کے ساتھ ہی لوگوں کے اذہان سے دور چلے جائیں گے۔ بحیثیت مجموعی تنگ عنایت پوری عصر حاضر کے ایک اچھے ظریف شاعر ہیں ہمیں ان سے اچھی ہی توقع رکھنی چاہیے۔
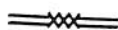
پانڈے رامیشوری پرساد عرف چھوٹے

پیشہ سے وکیل ہیں لیکن علم و ادب کا گہرا شعور و شوق رکھتے ہیں۔ شاعری

اور نثر نویسی سے بھی ان کی دلچسپی شروع سے ہی رہی ہے۔ کئی اخباروں کے نامہ نگار اور مضمون نگار ہیں انھوں ن نہ صرف عشقیہ شاعری کی ہے بلکہ حمد و نعت اور منقبت گوئی میں بھی حصہ لیا ہے۔ انھیں بھی پیغمبر اکرم ﷺ کے خانوادے سے گہری محبت ہے۔ اکثر سیوان کے مضافات میں ہونے والی محافل اور مجالس میں شرکت کے سبب انھوں نے منقبت اور نعت گوئی بھی کی ہے۔ ماتھر لکھنوی سے ملاقات کے بعد جن کے قصائد مشہور ہیں۔ پانڈے جی کو منقبت گوئی سے خاص لگاؤ پیدا ہوا خاص کر ان کے اس شعر سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے:

کہہ کے بدعت بھی مسلماں جب الگ ہو جائیں گے
ہو کے ہندو ہم اٹھائیں گے علم عباس کا

پانڈے جی کے مناقب بڑے موثر اور دل کو چھو لینے والے ہیں۔ مدح کے ایک سے ایک گوشے نکالے ہیں۔

ایک ہندو کر رہا ہے انتظار اپنی جگہ
بہر دیدارِ حسنؑ ہے بیقرار اپنی جگہ

ایک ہندو کا دل مائل نور ہے
آج مولا کو کچھ اور منظور ہے
ایک ہندو کے دل میں ہیں مولا علیؑ
باغِ جنت میں یہ بات مشہور ہے

پانڈے رامیشوری پرساد کے یہاں عشق کے کئی روپ اُبھرے ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

عشق جیتا ہے شرافت کا تقاضا بن کر
عشق مرتا ہے محبت کی حمایت کے لیے

عشق زنجیر پہنتا ہے بنائے سجدہ
عشق جذبات میں ڈھلتا ہے عبادت کے لیے

عشق اللہ کی رحمت کا نتیجہ یارو
عشق آیت ہے محبت کی تلاوت یارو
جذبۂ عشق کی تاریخ بتاتی ہے مجھے
عشق اُترا تھا تو فرہاد کی شہرت کے لیے

پانڈے جی کا دل ایک ہمدرد انسان اور ایک خالص ہندوستانی کا دل ہے جو انسانوں کی مجبوریوں اور معذوریوں پر آنسو بہاتا ہے تو دوسری طرف ملک و ملت کے لیے بھی ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔ ان کے یہاں وسیع القلبی پائی جاتی ہے۔

چھوٹے میں دورِ نو میں وفا کا ہوں آئینہ
مجھ سے جو ملنے آئے وہ دل کھول کر ملے

چھوٹے میاں نے شمع جلائی ہے خون سے
اس کا کمال دیکھنا پُروائیوں کے بعد
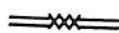
حواشی

(۱) تذکرہ بزم شمال، ص ۱۹۸، ۱۹۹۔
(۲) تذکرہ بزم شمال، ص ۳۰۸۔
(۳) تذکرہ بزم شمال، ص ۳۰۹۔
(۴) ایضاً

باب سوم

اردو شاعری میں
بہار کے ہندو شعرا کا حصہ

◉

جیسا کہ عرض کیا گیا بہار کی اردو شاعری میں یہاں کے صوفیائے کرام نے زبردست کردار ادا کیا ہے اسی طرح اس ریاست کے ہندو شعرا و ادبا نے حتی الامکان اس زبان اور اس کے ادب سے اپنی گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کر کے اردو شاعری کے سرمایے کو غنی تر کرنے میں زبردست رول ادا کیا ہے۔ ان میں تقریباً سبھی شعرا کے گھر کی زبان اردو تھی۔ اکثر نے اردو کا مضمون لے کر تعلیم حاصل کی اور کئی نے بعد میں اردو و فارسی کے استاد کی حیثیت سے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کا مہذب پیشہ اختیار کیا۔ دورِ متاخر کے ایک شاعر بابو رامیشور پرساد ایڈوکیٹ متخلص بہ گلوارا کا یہ بیان ملاحظہ فرمایئے، جس سے میری بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے:

> ''میرے گھر والوں کی زبان عرصہ سے اردو ہے اور میں نے بھی اردو مضمون لے کر بی. اے. کا امتحان پاس کیا ہے۔ اردو دیس کی ایک بڑی پیاری اور میٹھی زبان ہے، بولنے میں مزیدار، سننے میں خوشگوار اور سمجھنے میں آسان ہے۔ اس کی شاعری میں جو لطف ہے وہ میں نے کسی اور زبان میں نہیں پایا ہے۔ میرا خیال صرف جذباتی یا زبانی نہیں بلکہ میرے دل کا صحیح ترجمان ہے''(۱)۔

ریاست بہار کے ہندو شعرا نے شروع سے ہی نظم و نثر کی شکل میں جو کاوشیں کی ہیں ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا مطالعہ اردو کے لسانی اور تاریخی پس

منظر میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے مشترکہ گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور جو شعری تخلیقات پیش کی ہیں اس کے پیش نظر بہار کے اردو شعرا میں ان کی مشارکت اور مساعی نہایت مستحسن اور اہمیت کی حامل ہے۔ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق عظیم آبادی کے حالاتِ زندگی اور کلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انھوں نے اسلامی علوم وفنون کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ وسیع النظر انسان تھے اور وحدانیت کے قائل تھے۔ محمد ﷺ و آل محمد ﷺ سے گہری عقیدت اور وابستگی رکھتے تھے اور ساتھ ہی اسلامی عرفان و تصوف کے عناصر کو اپنی شاعری میں برتتے تھے۔ ڈاکٹر منصور عالم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> "اگرچہ مہاراجہ موصوف کی پیدائش ہندو گھرانے میں ہوئی جو نسلاً کائستھ تھے۔ لیکن ان کی پرورش و پرداخت بالکل اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لیے اسلامی تہذیب و تمدن نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر مرتب کیا تھا۔ وہ عقائد کے لحاظ سے صوفی منش اور موحد تھے۔ اسلامی تعلیم نے ان کو اسلام سے بالکل قریب کر دیا تھا۔ انھوں نے قرآن پاک کی چند آیات کی جو منظوم تفسیر لکھی ہے وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اسلامیات میں ان کو کافی دخل تھا" (۲)۔

شعرائے متقدمین نند لال گویاؔ بھی ایک صوفی شاعر تھے۔ فارسی میں ان کا دیوان ملتا ہے۔ اشپرنگر نے بھی اپنے کیٹلاگ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ سکھوں کے دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ ان کے فارسی دیوان کا ایک مخطوطہ جناب فصیح الدین بلخی مؤلف "تذکرہ ہندو شعرائے بہار" کو دستیاب ہوا تھا، جس کے ترقیمے میں کاتبِ دیوان نے شاعر کے کچھ احوال بھی درج کیے ہیں، جن کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ گویاؔ کا تعلق شمالی بہار کے شہر مظفر پور سے تھا۔ گویاؔ کا پورا دیوان جو غزلیات پر مشتمل ہے، عرفان و تصوف کے عناصر سے مملو ہے۔ یہ بھی

عرض کر دوں کہ گویا کی فارسی غزلیات کا انگریزی اور اردو زبانوں میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اردو میں ڈاکٹر عابد حسین مرحوم نے منظوم ترجمہ کیا تھا، جو چھپ چکا ہے۔

مہاراجہ نرائن موزوں عظیم آبادی بھی بہار کے ایک مایۂ ناز شاعر گزرے ہیں۔ ان کا فارسی دیوان بھی طبع ہو چکا ہے، جس کا مطبوعہ نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

موزوں عظیم آبادی کو شاعری میں شیخ علی حزیں سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ وہ ایک سیاست مدار تھے۔ صوبۂ بہار کے ناظم ریاست ہونے کے سبب زیادہ تر اوقات مملکت داری میں گزارتے تھے۔ لیکن شعر وسخن سے دلچسپی کے باعث فارسی اور اردو میں شاعری بھی کرتے تھے۔ راجہ رام نرائن موزوں کو عربی و فارسی زبانوں اور علم حساب میں عبور حاصل تھا۔ نظم و نثر لکھنے کی پوری قدرت و مہارت ان میں تھی۔ ادبی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات کہیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ صرف اتنا ہی پتا چلتا ہے کہ وہ ایک قابل قدر شاعر تھے۔ تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔

چند اقوال کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جس سے اس عظیم شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ بندرا داس خوشگو نے لکھا ہے:

> ''ہندی اور فارسی میں شعر گوئی کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ نثر بھی بہت پاکیزہ لکھتے ہیں۔ اکثر اوقات اپنے تخلص کی مناسبت سے اشعار بھی موزوں کرتے ہیں۔ تخلص شیخ علی حزیں نے عطا کیا تھا اور انھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کمِ وقت کی باوجود اکثر خوب کہتے تھے'' (۳)۔

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے چمنستان شعرا میں موزوں عظیم آبادی کو شاہ جہاں آبادی غلط لکھا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ان کے حالات اور اشعار ان تک نہیں پہنچے ہیں۔ اس لیے اگر شفیق نے موزوں کو عظیم آبادی کے بجائے

شاہ جہاں آبادی لکھ دیا ہے تو کوئی مضایقہ نہیں۔

میر حسن دہلوی نے لکھا ہے کہ بہت اچھے شاعر تھے، ریختہ میں کم کہا ہے بلکہ نہیں کے برابر کہا ہے۔

دیگر تذکرہ نویسوں نے موزوں عظیم آبادی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ وہی ہے جو خوشگو نے تحریر کیا ہے، جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ زیادہ تر لوگوں نے ان کے ناظم صوبۂ بہار ہونے اور سیاسی جنگوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ موزوں عظیم آبادی نے اردو میں کچھ کہا ہی نہیں۔ ان سے منسوب یہ شعر تو کافی مشہور ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

موزوںؔ کے چند اشعار یہ ہیں:

ابر تو خود ہی خجالت سے ہے پانی پانی
کب مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ

بھولی نہیں ہے مجھ کو بتوں کی ادا ہنوز
دل کے نگیں پہ نقش ہے نامِ خدا ہنوز

چادر تقدیر کی ہرگز نہیں ہوتی رفو
تا قیامت سوزن تدبیر گر سیتی رہے

بلبل بے درد کو نسبت ہے کیا پروانے سے
وصل میں مر جائے وہ یہ ہجر میں جیتی رہے

قول موزوںؔ پر نہ ہرگز کیجیے گا اعتبار
جونک کو مٹی ملے تو بھی لہو پیتی رہے

کچھ گرانی نہیں مجھ کو وہ ستم گار کے ساتھ
دل پگھل چو ہی پڑا اشک سبک بار کے ساتھ

یہ باکمال شخص ۱۷۶۳ء میں نہایت بے دردی کے ساتھ گنگا کی لہروں کے حوالے کر دیا گیا اور یہ صرف اقتدار کی جنگ کے سبب ہوا۔

مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق، مہاراجہ شتاب رائے کے فرزند تھے۔ مہاراجہ کا خاندان دہلی کا خاندان تھا۔ "مہاراجہ شتاب رائے کا ادبی ذوق بھی بہت بلند اور اعلیٰ تھا۔ وہ شاعروں، فنکاروں اور صناعوں کے نہایت قدردان تھے۔ اسباب میں ان کے گھرانے پر "ہمہ خانہ آفتاب" کی مثل صادق آتی ہے۔ اشرف علی فغاں، مہاراجہ کے دربار سے وابستہ تھے"(۴)۔

مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے مہاراجہ کلیان سنگھ عاشقؔ بھی اپنے باپ کی طرح ہی ادب دوست اور علم پرور تھے۔ انھوں نے اردو اور فارسی زبانوں میں اپنے قلمی آثار یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ بھی شعرا کے سرپرست تھے۔ انھوں نے بھی علم و ادب کی جس قدر خدمت ہو سکی، کی۔

منشی کیولا پرساد فقیرؔ مظفرپوری بھی بڑے ذی علم شاعر و ادیب اور خوش نویس گزرے ہیں۔ یہ ہفت قلم تھے اور "خورشید رقم" کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں اب بھی کتاب خانوں میں موجود ہیں۔ انھوں نے وید کا ترجمہ بھی کیا تھا، جس کا مخطوطہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

یہ اردو اور فارسی زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ شاعری میں سید مبارک علی طالبؔ کے شاگرد تھے۔ ان کا فارسی دیوان ۱۸۷۱ء میں مظفرپور سے چھپ چکا ہے۔ غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے اردو اشعار میں زبان و بیان پر مکمل قدرت نہ ہونے کے باعث اظہار میں روانی کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکی

ہے جب کہ اردو کے مقابلے میں ان کا فارسی کلام زیادہ متوازن، بہتر اور موثر ہے۔

کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ عظیم آبادی کی شخصیت بہار میں اردو شاعری کے فروغ دینے میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔ انھوں نے اپنے ماہانہ طرحی مشاعروں کی بدولت عظیم آباد میں شعر و سخن کا بازار گرم کر دیا تھا۔ کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ کے والد کنور ہیرا لال ضمیرؔ بھی شاعر تھے۔ رحمتیؔ کے ماہانہ طرحی مشاعروں کا گلدستہ ''تحفۂ انجمن رحمتیؔ'' کے نام سے چھپتا تھا۔ ان کے مشاعروں میں عظیم آباد کے شعرا کی کافی تعداد شریک ہوتی تھی۔ کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ کے مشاعرے ہماری قدیم تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد و یک جہتی کی روشن مثال تھے۔

رائے ایشوری پرساد عطاؔ عظیم آبادی، شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے شعر و شاعری کی روایت کو مستحکم تر کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ساتھ ہی فن عروض کو بھی بڑھاوا دیا۔ وہ مسلم الثبوت استاد کے شاگرد تھے اور ایک وقت وہ آیا جب خود استادی کے درجے پر فائز ہو گئے۔ افسوس کے ان کا دیوان زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا ورنہ اردو شاعری میں ایک اضافہ قرار پاتا۔

شادؔ کے شاگردوں میں رائے بھوانی پرساد آزادؔ بھی تھے۔ جن کا تعلق راجہ رام نرائن موزوںؔ عظیم آبادی کے خاندان سے تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبان میں شاعری کی قدرت رکھتے تھے۔ اپنے گھر پر مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور اسے حتی الامکان فروغ دیتے تھے۔

بابو کملا پرساد عاجزؔ عظیم آبادی کی شاعری بھی اس لائق ہے کہ اس کا بھرپور مطالعہ کیا جائے۔ یہ عہد ہی روایتی شاعری کا تھا اس لیے ایسے شعرا کے یہاں عصری حسیت ناپید نظر آتی ہے جب کہ روایتی شاعری میں ان لوگوں نے زبردست قافیہ پیمائی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

یہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے اور ان کے اشعار گلدستوں کی

زینت بنتے تھے۔ طول وطویل غزلیں کہنا ان کا مرغوب مشغلہ ہوتا تھا۔

لالہ ماتا دین حشمتؔ عظیم آباد کے مشاہیر شعرا میں تھے۔ مظفر پور میں منصفی کے عہدے پر فائز تھے۔ وزیر علی عبرتؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ مولوی خیرات احمد محبؔ سے گہری دوستی تھی۔ محبؔ کے ''خمسۂ کاملہ'' میں ان کی یہ رباعی ملتی ہے:

خوشا وہ لوگ جو آئے ہیں بزم ماتم میں
خوشا وہ ہاتھ جو پیٹے حسین کے غم میں
وہ دل ہو خاک نہ ہو جس میں اہل بیت کا غم
وہ آنکھ پھوٹے جو روئی نہ ہو محرم میں

مذکورہ رباعی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اہل ہنود شعرا نے نہ صرف غزلیہ اسلوب اپنایا تھا بلکہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور محمد ﷺ و آل محمد ﷺ سے گہری عقیدت بھی رکھتے تھے۔ ایسے ہندو شعرا کی تعداد بہت زیادہ ہے، جنھوں نے پیغمبر اکرم ﷺ، حضرت علیؓ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی مدح کی ہے۔ نعت و منقبت کہی ہے۔ اس سے ان کی رواداری اور مسلمانوں سے یکجہتی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

غزل گوئی میں حشمتؔ کا انداز و اسلوب بھی وہی ہے جو اس زمانے کا پسندیدہ طرز شعر گوئی تھا۔

لالہ جگر ناتھ سنگھ ان شعرا میں ہیں جنھوں نے مثنوی پر توجہ دی اور زمانے کے رواج کے مطابق ایک عشقیہ مثنوی لکھی، جس کا نام ''ست کنور'' ہے۔ یہ مثنوی قلمی صورت میں ہے۔ اس کی زبان ہندی آمیز ہے۔ اس میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ اخلاقی اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ اس سے انسان میں اخلاقی صفات پیدا ہوسکتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ تقریباً ڈھائی تین سو برسوں کے دوران بہار کے ہندو شعرا نے اردو شاعری کی مختلف اصناف اور گوناگوں موضوعات پر طبع آزمائی

اور اپنے افکار و خیالات کے ذریعہ اسے مالا مال کیا۔ اسلوب اور طرز ادا کے اعتبار سے بھی ان میں سے بعض نے فارسی آمیز الفاظ تو کچھ نے اردو کے ساتھ ہندی آمیز زبان کا استعمال کر کے اردو شاعری کو غنی اور مقبول عام بنانے کی کوشش کی ہے۔

اردو میں ہندو شعرا نے اسلامی موضوعات پر بھی قابل قدر مواد پیش کیا ہے۔ خاص کر واقعاتِ کربلا اور اس کے اثرات نے ان کے دلوں کو بھی بے حد متاثر کیا اور وہ اس دلدوز واقعے کو نظم کرنے میں پیچھے نہیں رہے۔ حمد و نعت اور منقبت و قصیدہ گوئی میں بھی ہندو شعرا نے اپنا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہار کے ہندو شعرا کے کارنامے سنہری حروف میں لکھنے کے لائق ہیں اور قومی یکجہتی و اتحاد کے پس منظر میں ان کی خدمات کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی۔ ہمارا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کے قصوں اور تذکروں کا بار بار ذکر کیا جائے تاکہ موجودہ دور میں ہندو شعرا کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے اور وہ اردو شاعری کے چراغ کی لَو کو اور تیز کرنے کے لیے مسلم شعرا کے دوش بہ دوش میدان عمل میں قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھتے رہیں۔

اس کتاب میں جتنے ہندو شعرا کا ذکر کیا گیا ہے میرا یقین ہے کہ ابھی تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری رکھا جائے تو ان کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور میں نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ اپنی اس تحقیقی کاوش کا سلسلہ جاری رکھوں گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ابھی ایسے کچھ شعرا موجود ہیں جن تک نارسائی کے سبب میں نہیں پہنچ سکا ہوں لیکن انشاء اللہ آئندہ انھیں ضرور شاملِ کتاب کیا جائے گا۔
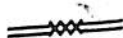
حواشی

(۱) تذکرہ ہندو شعرائے بہار، ص ۱۵۱۔

(۲) مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق، ترتیب وتہذیب ڈاکٹر منصور عالم، ص ۱۷۔

(۳) سفینۂ خوشگو، دفتر ثالث، ص ۳۵۵۔

(۴) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۳۴۱۔
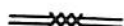
باب چہارم

حرفِ آخر

◉

اردو شعر و ادب نے جو کل سے آج تک اپنی ارتقائی منزلیں بہ حسن و خوبی طے کی ہیں اور جس کے نتیجے میں اسے فروغ حاصل ہوا ہے۔ اس کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ ملک میں بسنے والی قوموں میں کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب نے ہی اپنے کھلے ذہن کا ثبوت دیا ہے۔

جب اس ملک میں فارسی زبان کا بول بالا تھا تو اس وقت بھی مسلمانوں کے دوش بدوش غیر مسلموں نے فارسی زبان سیکھی اور اس زبان میں تحصیلات علوم کے بعد اس کے ادب کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اہل ذوق اور صاحب علم نے ہمیشہ ادبی سرمایوں میں اضافہ کیا ہے۔ البیرونؔی نے ہندوستان آنے کے بعد سنسکرت زبان سیکھی اور اس زبان کے ادب اور تاریخ کے سرمائے کو فارسی اور عربی زبان میں پیش کر کے اِن زبانوں کے واقف کاروں کو ہندوستان کی قدیم تاریخ اور معاشرت سے آگاہ کیا۔ سلطان سکندر لودی کے عہد (۸۹۵-۹۱۲ھ) میں ہندوؤں نے فارسی پڑھنا شروع کیا۔ لیکن اس زمانے میں ان کی فارسی دانی کا مقصد دفتروں میں ملازمت تک ہی محدود تھا۔ لیکن سلطان سکندر لودی کے زمانے میں جس فارسی زبان کی داغ بیل یہاں پڑ چکی تھی وہ دفتروں اور درباروں میں ملازمت کے مقصد سے آگے بڑھ کر لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگی اور آہستہ آہستہ پورے ملک میں فارسی نے قبضہ کر لیا۔

مغلیہ سلطنت کی طویل تاریخ میں یہ زبان بہت پھولی پھلی۔ اکثر سلاطین فارسی زبان کے شاعر و ادیب بھی تھے۔ انھوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے اس زبان میں شاعری بھی کی اور نثر نویسی بھی۔ ساتھ ہی ان کی علم پروری اور ادب نوازی کے

قصے سن سن کر دور دراز کے شعرا و ادبا اور اہل کمال ان کے درباروں کا رُخ کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا ملک با کمالوں سے بھر گیا۔ ملک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بھی بڑے بڑے باکمال ملتے تھے۔ ان میں ہندو اور مسلمان سب ہی تھے۔ گیارھویں صدی ہجری میں یہ اثرات اتنے نمایاں ہو گئے تھے کہ کیا ہندو اور کیا مسلمان سب فارسی زبان کی شیرینی اور دل نشینی کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں میں چندر بھان برہمن، نند لال گویا، اُجاگر چند اُلفت اور کئی دوسرے شعرا و ادبا فارسی زبان میں اپنی مافی الضمیر کی ادائیگی نثر و نظم دونوں صورتوں میں کرنے لگے۔ لیکن بارھویں صدی ہجری فارسی کے لیے سخت گزری اور اس کی جگہ اردو لینے لگی اور جب فارسی کی بساط ملک سے اٹھنے لگی تو مسلمانوں کی طرح ہندو شعرا و ادبا نے بھی اردو میں ہی سخن طرازی کو شیوہ بنا لیا۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کے مناظر اردو شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مذہبی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ ایسے مسلم شعرا کی تعداد بھی کم نہیں ہے، جنھوں نے ملک کی ہندو تہذیب و ثقافت کی عکاسی اپنے کلام میں کی ہے جب کہ ایسے ہندو شعرا بھی خاصی بڑی تعداد میں ملتے ہیں، جنھوں نے حمد، نعت، منقبت اور بزرگانِ دین و اولیائے کرام کی مدح و ستائش میں قصیدے کہے ہیں۔ ان ہندو شعرا نے واقعات کربلا جیسے تاریخ عالم کے دلدوز اور غم انگیز واقعے اور پیغمبر اکرم ﷺ کے پیارے نواسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقا کی جاں گداز شہادت پر مرثیے، سلام اور نوحے کہے اور اس شہادتِ عظمیٰ پر ہمارے ساتھ ہمارے غم میں شریک و سہیم رہے اور ہیں۔

دوسری طرف مشاعروں کی بدولت بھی اردو زبان اور اردو شاعری نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ ان مشاعروں میں مسلم شعرا کے ساتھ ہندو شعرا کی شرکت اور اکثر ہندو شعرا کی جانب سے ایسے مشاعروں کا اہتمام و انصرام، اردو شاعری سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا مظہر ہے۔ بہار میں خاص کر عظیم آباد میں کنور سکھراج بہادر رحمتیؔ

کے یہاں ہونے والے ماہانہ طرحی مشاعروں اور ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے ہندو اور مسلمان شعرا کی کافی بڑی تعداد، اس زبان اور اس کی شاعری کی عوام میں مقبولیت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ مشاعرے اردو شعر و ادب کے فروغ میں معاون تو تھے ہی ساتھ ہی ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کی پیشکش میں بھی قابل ذکر رول ادا کرتے رہے ہیں۔

البتہ ایسے ہندو شعرا کی تعداد بھی بہت کم ہے، جن کا مجموعۂ کلام مطبوعہ صورت میں ملتا ہو۔ زیادہ تر کلام یا تو ضائع ہو گیا ہے یا پھر مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری اور گورنمنٹ اردو لائبریری میں کچھ ہندو شعرا کے مجموعے ضرور موجود ہیں۔

متقدمین شعرا اور متوسطین شعرا میں میں نے ایک بات مشترک محسوس کی، وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اردو کی روایتی شاعری کی ہے اور ان کے کلام میں موجودہ دور کی شاعری کی طرح گوناگوں موضوعات کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے جس کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ تر حسن و عشق کے معاملات اور گاہ گاہ عروضی باریکیوں پر ہی دھیان مرکوز کیا گیا ہے۔ داخلی موضوعات کی پیشکش میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ صنائع شعری کا استعمال بھی ایک شاعرانہ پہلو ہے، جس پر ان لوگوں نے توجہ کی ہے، لیکن زندگی کے حقایق، اس سے متعلق مسائل، اپنے اِرد گرد کے حالات کی پیشکش کے معاملے میں یہ شعرا ناکام ہوئے ہیں۔

ویسے اس حقیقت پر بھی توجہ دی جانی چاہیے کہ یہ شعرا جن زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں، اس دور میں زندگی کے مسائل نہ تو اتنی بڑی تعداد میں تھے اور نہ ہی زندگی مسائل میں اتنی الجھی ہوئی تھی۔ فارغ البالی میں جینے اور زندگی بسر کرنے والوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ زندگی کے کسی پیچیدہ مسئلے کو پیش کرے، تقریباً ناممکن ہے۔ بس لے دے کر حسن و عشق کا ہی ایک موضع تھا جس پر اِن شعرا نے پوری تفصیلات سے طبع آزمائی

کی ہے۔

جب کہ متاخرین کا دور اس کے مقابلے میں ایسا دور ہے جہاں طرح طرح کے مسائل سر اٹھا چکے تھے اور غم روزگار کے کچو کے دن رات شاعروں کو لگ رہے تھے۔ اردو کی کچھ تحریکیں بھی مسائل کی پیش کش پر مجبور کر رہی تھیں۔ انسانوں کا استحصال، آزادی کی تحریک اور آزاد رہنے کے تصور نے اردو شاعری میں ایک انقلابی رُجحان پیدا کیا۔ بہار کی شاعری اور شعرا بھی اس سے جدا نہیں رہ سکے۔ انھوں نے بھی ان مسائل پر قابل قدر توجہ کی اور ان کی پیش کش کا وسیلہ اپنی شاعری کو بنایا۔ خاص کر ملک میں تحریک آزادی نے خاصا اثر ڈالا اور شعرا نے اتحاد اور وطن پرستی کے موضوعات پر خوبصورت انداز میں روشنی ڈالنی شروع کر دی۔ اس اعتبار سے بھی ہمارے ہم وطن ہندو شعرا قابل احترام ہیں۔

دور جدید نے جہاں سب کچھ بدل ڈالا وہیں اردو شاعری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ کئی لوگوں نے اخلاقی تعلیمات، انسانی اقدرا کا تحفظ، سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت، مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ہمدردی اور تعلیم کی ترویج پر زور دیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ شعرا کے اذہان اپنے اِردگرد کے ماحول سے اثر پذیر ہوئے ہیں۔

آج بھی ہمارے صوبے کے گوشہ و کنار میں ایسے کئی ہندو شعرا ہیں جو اردو شاعری کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔

دورِ متقدمین، دور متوسطین اور دورِ متاخرین کے ہندو شعرا کی تعداد پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو ہم پاتے ہیں کہ متقدمین شعرا کی تعداد متوسطین سے کم ہے اور متوسطین کا دور متقدمین اور متاخرین کے ادوار کے مقابلے میں اردو شاعری کا سنہرا دور تھا۔ اس دور میں اگرچہ شعرا نے موضوعاتی سطح پر کوئی خاص کارنامہ نہیں پیش کیا ہے لیکن اردو شاعری کی مقبولیت کے لحاظ سے یہ دور دو دیگر ادوار سے نمایاں ہے۔

دورِ متاخرین کے شعرا کی تعداد بھی بہت ہے۔ یہ دور اردو شاعری میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور طرح طرح کے مسائل کی پیشکش کے رُجحان کے اعتبار سے مذکورہ دونوں ادوار پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس دور کے شعرا صرف عشق و عاشقی یا حسن و عشق کے معاملات میں بند نہیں ہیں بلکہ طرح طرح کے مسائل کی پیش کش کو انھوں نے اپنا شیوہ بنا رکھا ہے۔

دورِ متقدمین، دور متوسطین اور دورِ متاخرین، تینوں ادوار میں اردو شاعری کی محبوب و مقبول ترین صنف شاعری یعنی اردو غزل پر اِن ادوار کے شعرا نے خاصا مشق کیا ہے یعنی اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اردو غزل شروع سے لے کر آج تک کے شعرا کو اپنے دام حسن میں باندھے ہوئے نظر آتی ہے اس سے صنف شاعری کی حیثیت سے اس کی مقبولیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور اس کے ''شاعری کی آبرو'' ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے۔

ہندو شعرا میں کم ہی شعرا ایسے ملے جنھوں نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف پر جم کر طبع آزمائی کی ہے۔ یوں شاعری میں مہارت رکھنے کے سبب ممکن ہے ایک شاعر ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے صلاحیت رکھتا ہو اور اس نے اس صلاحیت کا مظاہرہ بھی کیا ہو، لیکن زیادہ تر اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی اس نے غزل کے ذریعہ ہی کی ہے۔ تینوں دور کے شعرا کے مطالعے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان شعرا کا غزل کے سلسلے میں خاص لگاؤ قابل احترام ہے۔ آج بھی ہندو شعرا کے مابین غزل پسندیدہ صنف شاعری ہے، جس سے اردو شاعری میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

ایک بار پھر میں اپنے اس خیال کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ ماضی کی طرف ہندو شعرا میں اردو شاعری کا رُجحان، توانا اور دلکش نظر نہیں آتا۔ یعنی یا تو اب اکثریت میں اردو شاعری سے دلچسپی نظر نہیں آتی یا اردو کی دلکشی انھیں متاثر نہیں کر پا رہی ہے۔

دوسری بات تو اپنی جگہ اٹل ہے کہ اردو کی دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ بلکہ ملک کے سیاسی حالات نے اردو کے ساتھ سوتیلا پن رویہ اختیار کرلیا ہے اور بھولے بھالے لوگوں پر یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ یہ زبان مسلمانوں کی زبان ہے، جب کہ یہ بھارت کی زبان ہے۔ اب اردو صرف مسلمان ہی پڑھتے ہیں جب کہ ماضی میں ہر ہندوستانی ہندوستان کی زبان سمجھ کر اسے پڑھتا تھا۔

اردو کے اداروں اور تعلیمی مراکز کے ساتھ سرد مہری کا رویہ بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تعصب انگیز رویے نے جہاں اردو کی تعلیم و تدریس کو نقصان پہنچایا ہے وہیں ملک کے عام لوگوں خاص کر اہل ہنود کو اردو سے دور کر دیا ہے اس لیے ملک گیر سطح پر اردو کے کچھ ہندو شعرا کو چھوڑ کر جن کی زبان ہی اردو رہی ہے، عام طور پر وہی لوگ اردو میں شاعری کر رہے ہیں جن کو اس زبان اور اس کی شاعری سے خاص دلچسپی ہے اس لیے موجودہ نامساعد حالات سے مایوسی کا ایک احساس خود بخود ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے اور ہندوؤں میں اردو کی مقبولیت کا متاثر ہونا فطری ہو جاتا ہے۔

یہاں ہمارے اردو کے اداروں کی بھی ذمہ داریاں بنتی ہیں یعنی وہ غیر مسلموں میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کچھ منصوبہ بند پروگرام چلانے کی طرف اگر توجہ کریں یا بہار کے اسکولوں اور کالجوں میں جہاں اردو کے شعبے تو ہیں لیکن طالب علموں کی تعداد میں زبردست کمی آگئی ہے، اور اس مسئلے سے کیسے نپٹا جا سکے، اس پر انھیں غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلے ہم قدم آگے بڑھائیں پھر حکومت سے اپنے مطالبات پورے کروانے کی کوشش کریں۔

بہرحال ہمیں ان لوگوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جو اس تعصب کے ماحول میں بھی اردو کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں اور ایسے شعرا و ادبا کی حوصلہ افزائی کا کوئی پہلو نظرانداز نہیں کرتے اور نہیں کیا جانا چاہیے۔

باب پنجم

کتابیات / اخبارات و رسائل

کتابیات

(۱) (الف۱،۲) ''اردو درپن''، قیوم خضر، اشارہ پرکاشن، پٹنہ، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۔
(۱) (ب۳) مضامین چکبست، ص ۲۔
(۲) ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (۱۲۰۴ - ۱۸۵۷ء)''، ڈاکٹر اختر اورینوی، لیبل لیتھو آفسیٹ پریس، پٹنہ، ۱۹۵۸ء۔
(۳) ''بہار میں اردو مرثیہ نگاری''، سید حسن عباس، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ. ڈی.، ۱۹۸۸ء۔
(۴) ''بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا''، ڈاکٹر علی احمد دانش، لیتھو آفسیٹ پریس، پٹنہ، ۱۹۸۹ء۔
(۵) ''بہار کے نظم نگار شعرا''، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، بہار اردو اکادمی، پٹنہ۔
(۶) ''تاریخ شعرائے بہار'' (حصہ اوّل)، عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی، دی قومی پریس لمیٹڈ، بانکی پور پٹنہ، ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء۔
(۷) ''تاریخ مگدھ'' (دوم)، مولوی فصیح الدین بلخی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۱ء۔
(۸) ''تاریخ ادب اردو''، رام بابو سکسینہ، مترجم مرزا محمد عسکری، منشی نول کشور، لکھنؤ، سنہ طباعت ندارد۔
(۹) ''تذکرہ بزم شمال'' (جلد اوّل)، شاداں فاروقی، ناشر: شعرستان، نورالحسن

لین، دربھنگہ، حمید برقی پریس لہریا سرائے، دربھنگہ، ۱۹۸۶ء

(۱۰) ''تذکرہ ہندو شعرائے بہار''، فصیح الدین بلخی، نیشنل بک سنٹر، ڈالٹین گنج، ۱۹۶۲ء۔

(۱۱) ''تصریحات و اشارات'' (مجموعۂ مضامین)، شاہ مقبول احمد، اعجاز پرنٹرز، کلکتہ، ۱۹۸۶ء۔

(۱۲) ''حیاتِ دوام''، (تذکرہ شعرائے گیا)، مختار احمد عاصی، ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۶۵ء۔

(۱۳) ''حقیقت بھی کہانی بھی''، سید بدرالدین احمد بدر عظیم آبادی، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، دی آرٹ پریس، پٹنہ، ۱۹۸۸ء۔

(۱۴) ''دفتر گم گشتہ یا بہار میں اردو شاعری کا ارتقا''، ڈاکٹر کلیم عاجز، ناشر: مصنف، پٹنہ، ۱۹۸۸ء۔

(۱۵) ''دیوانِ جوشش''، قاضی عبدالودود۔

(۱۶) ''سراج و منہاج'' (مجموعۂ مضامین)، پروفیسر اختر اورینوی، ایوانِ اردو، دی آزاد پریس، پٹنہ، ۱۹۶۴ء۔

(۱۷) ''گلشن حیات''، قیس رضوی، سلیمانی پریس، پٹنہ، ۱۳۴۴ھ۔

(۱۸) ''مضامین چکبست''، پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی، انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد، ۱۹۴۶ء۔

(۲۹) ''مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق''، ڈاکٹر محمد منصور عالم۔

(۳۰) ''ہندو شعرا''، خواجہ عشرت لکھنوی، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۱ء۔

اخبارات ورسائل

(۱) ماہنامہ تاج گیا، بابت ماہ مارچ و اپریل ۱۹۲۲ء، مدیر جگیشر پرساد خلش ندروی گیاوی۔

(۲) خدا بخش لائبریری جرنل، شمارہ ۱۱۴، مقالہ: منشی کیولا پرساد فقیر مظفرپوری خورشید رقمی اور دیوان فقیر کا نسخۂ خدا بخش: ایک تعارف، از ڈاکٹر سید حسن عباس۔

فہرست شعرا

شعرائے متقدمین :

شعرائے متوسطین:

یادداشت

URDU SHA-E-RI MEIN BIHAR KE HINDU SHO-A-RA KA HISSA

उर्दू कविता के क्षेत्र में बिहार के हिन्दू कवियों का योगदान

Dr. Asrar Ahmad

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-596-0